

یادوں کے

صدیوں کی مسافت طے کر کے آئی ہوں۔ میرا انگ
انگ ٹھکن زدہ تھا۔ آنکھیں گویا رو کر کر تھک چکی
تھیں۔

میں بھلا کس کا گریبان پکڑتی، کسے مجرم ٹھہراتی۔
میری بات پر بھلا کس نے ایمان لانا تھا۔ میں ماما کو کچھ
بتاتی تو نہیں پائی تھی۔ بھلا بتاتی بھی کیا؟ یہ میرا اپنا ہی تو
فیصلہ تھا۔ ماما نے مجھے کس قدر سمجھایا تھا مگر میں اپنی
سادگی میں کچھ سمجھ ہی نہیں پائی۔

مجھے چہرے دھنسنے کا دعوا تو بھی نہیں رہا تھا مگر میں
حیران تھی کہ بعض لوگ کس طرح صورت بدل
کر سامنے آتے ہیں۔ ہر دفعہ ان کا نیا چہرہ نظر آتا تھا۔

پا ہر چمکتی دھوپ کا راج تھا۔ گرم لو کے تھپیڑوں
نے گویا ہر شے کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے کھڑکی
کے پردے ہٹا کر باہر دیکھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا میرا دل
سینہ توڑ کر گرم اور جھلسا دینے والی زمین سے لپٹ لپٹ
کر نین کر رہا ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے ماما مجھے بہت سمجھاتی، بھجاتی رہی
تھیں۔ زندگی کے نشیب و فراز، اتار چڑھاؤ۔ مگر میں
انہیں بھلا کیا بتاتی۔ میرا دل تو آتش کدہ بن چکا تھا۔ میں
مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بنادی گئی تھی۔ میرے
لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا خود نشی کے برابر تھا۔
آج آٹھواں دن تھا اور مجھے لگتا تھا گویا میں

مکہ مکرمہ



ایسا چہرہ جو کسی بھی سادہ دل رکھنے والے کو دھوکے میں مبتلا کر سکتا تھا۔

میری سادگی میرے لیے ہمیشہ نقصان کا باعث بنی تھی مگر اس دفعہ تو میرے دل کا نقصان ہو گیا تھا، یوں لگتا تھا گویا کسی نے میرا دل فوج کر کسی پتھر کے نیچے رکھ کر پھینک دیا ہے۔

مجھے اس سے بے تحاشا محبت جو ہو گئی تھی اور میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کبھی اس طرح کسی اور کی جھوٹی داستان سن کر بدگمان ہو جائے گا۔ اس کی بدگمانی کے کھاؤ نے میرے دل میں نیزے اتار دیے تھے۔

مگر میرے ساتھ بھلا ہوا کیا تھا؟

ان دنوں میرے ستارے گردش میں تھے۔ نجانے کس منحوس گھڑی میں دو ماہ سے ڈیڑھ فون خود بخود ٹھیک ہو گیا تھا اور ممانک یہ منحوس خبر بغیر کسی دشواری کے پہنچ چکی تھی۔ سدا کی کہنی، فسادن اور ہلا کی کم طرف غانیہ کے ہلکے پیٹ میں میرے یعنی ساجیہ مراد کے متعلق ”خبر“ بھلا کیسے ٹھہر سکتی تھی مہماؤنوں کھڑکا کر میری شان دار کامیابی کی اطلاع پہنچا دی تھی۔

”خالہ! ساجی میٹرک میں ہیٹ ٹرک مار چکی ہے۔ اس مرتبہ بھی سابقہ ریکارڈ قائم رکھا ہے محترمہ خیر سے صرف تین مضمون کلیئر کر رکھی ہیں۔ باقی سب میں گول انڈا لگتا ہے پرچوں میں نہاری، جھیلجی اور گلاب جامن کی ترکیب لکھ کر آئی تھی۔“

فون تو بند ہو چکا تھا اور مہماؤن سے میری دھناتی کرنے کے بعد صوفے پر بیٹھی ہانپ رہی تھیں۔ غم وغصے سے ان کا سرخ و سفید چہرہ جھٹک رہا تھا۔ سبز آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔ یونیورسٹی کی پوزیشن ہولڈر میری پیاری ماما کا حد سے مارے برا حال تھا۔

”بے شرم! چلو بھائی میں ڈوب مرو۔ انیس سال کی ہو چکی ہو۔ ابھی تک میٹرک میں انکی ہو۔

تمہارے ساتھ کی گریجویشن اور ماسٹرز کر کے دو بیچے بھی کھلا رہی ہیں۔“

”آپ کی سستی کی وجہ سے لیٹ ہو رہی ہوں۔ ورنہ اس وقت آپ بھی نائون چکی ہو تیں۔ میں نے افسوس کے عالم میں مہماؤن گزرتے وقت کا احساس دلانا چاہا تھا۔ مہماؤن کو دوسرا جوتانا مارنے لگیں۔

”سوری مہماؤن! میں فوراً“ صوفے کی اوٹ میں کشن اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ مہماؤن نے بے حیائی کے اس عظیم مظاہرے کو ملاحظہ کرنے کے بعد نجانے کس سوچ میں گم ہو چکی تھیں۔

میری نظریں مہماؤن کے خالی پیروں پر تھیں۔ سو میں اطمینان سے صوفے پر ڈھس گئی۔ عام حالات میں وہ

جوتے کے ساتھ پھینٹی لگانا میرے خلاف سمجھتی تھیں۔ عام حالات میں تو محض مجھے گھوریوں سے ہی نواز دیا جاتا تھا۔ اور مہماؤن کا اثر ہی اس قدر ہوتا تھا کہ میں فوراً ”ہی حواس باختہ ہو جاتی۔ اگرچہ مہماؤن کو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ میری جوتے کے ساتھ دھناتی کریں مگر خیر سے ”معاملہ“ ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ بھی کہاں تک ضبط کرتیں۔

میٹرک میں مجھے تیسرا سال لگ چکا تھا۔ میری کلاس فیلوز اور کزنو غور مجھ سے کہیں آگے نکل چکی تھیں، مگر میں اپنے کند ذہن کو بھلا کہاں سے پالش کرائی اور پھر سائنس دانوں کی ”یکواس“ میرے دماغ میں ساتی ہی نہیں تھی۔ نجانے کتنے ہی یونیورسٹی نالائق سے گہرا کر دوسرے ہی دن بھاگ گئے تھے۔ مجھ جیسی کند ذہن، نالائق کوٹھ مفر کے ساتھ بھلا دماغ کھانے کی ضرورت ہی کیا تھی، جسے طبیعات کے تعارف کی الف ب بھی نہیں آتی تھی۔

باقی مضامین میں بھی میری دلچسپی ایویں سی تھی۔ ریاضی کو دیکھ کر تو مجھ پر زلزلہ طاری ہو جاتا تھا۔ ابھی پچھلے دنوں یہی کوئی چار پانچ ماہ پہلے فزکس کی تیاری کرواتے ہوئے، میری جان سے پیاری غانیہ نے اچانک میری ذہانت کو جانچنے اور جو کچھ پڑھایا تھا اس کا ٹیسٹ لینے کی غرض سے یو پچھا۔

”ساجی! دس منٹ کے اندر اندر جواب دیتی جانا“ آج تمہیں پڑھا کر میں نے اسو کی طرف جانا ہے۔ وہ میرے لیے کاڈ کا اور چیخوف کی کتابیں لے کر آیا ہے۔ اور میں وہ کتابیں پڑھنے کے لیے تخت بے چین ہو رہی ہوں۔“

غانی کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ ان فضول کتابوں کے نام لے کر گویا پوری پوری اور خطائی کا ڈال لقا اس کے منہ میں گھل گیا تھا۔ میرے منہ کے زاویے اسو کا نام سن کر ہی بننے، بگڑنے لگے تھے۔ منہ میں گویا کروے بادام آگئے۔ حالانکہ یہ چاکلیشی ہیرو جیسا کزن فریڈز کے درمیان گردن اگڑانے اور دوستوں کے درمیان ویلیو بنانے کا سبب تھا۔

”چھوڑو بھی غانی! جس رائٹر کا نام ہی اتنا خوف زدہ کر دینے والا ہو۔ اس کی تصنیف کتنی بکواس ہوگی۔ بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا چیخوف۔ یعنی تراخوف ہی خوف۔ اور یہ فرزانہ کا ڈکا۔ ایسے لگتا ہے جیسے راز اور کاٹنے یعنی خورک کاڈ کر کیا جا رہا ہے۔ ہائے غانی! مجھے تو بھوک بھی لگ گئی ہے۔“ میں نے پیٹ پکڑ کر دہائی دی تو غانی نے ہاتھ میں پکڑی کتاب میرے سر پر دے ماری۔

”بھوسا بھرا ہوا ہے یہاں۔“ کتاب کے وزن سے میرے دماغ کی چولیس ہل کر رہ گئی تھیں۔ اوپر سے غانیہ کا موڈ بگڑ گیا تھا۔

”تمہیں ٹھیک ہی یاد رہن، دھون اور درزن کا خطاب دیا گیا ہے۔ تمہارا دماغ پڑھنے کی طرف نہیں مائل ہونے والا۔ پکڑے اور کھانے کے علاوہ کچھ نہیں سوچتا۔ کھا کھا کر ایک دن غبارے کی طرح پھٹ جاؤ گی۔ موتی! غانی میری اچھی صحت پر چوٹ کرنے سے باز نہیں آتی تھی اور کھانا پکانے کے طعنے دیتا تو مہماؤن اور ان کی پیاری بھانجی غانی کا دل پرینہ مشغول تھا۔ میں نے تو اکثر ہی ماؤں کو آپس بھرتے دیکھا ہے کہ ان کی بیٹیاں بچن کے نام سے ہی دور بھاگتی ہیں۔ سینے پر دے کا بھی کوئی شوق نہیں ہوتا۔ گھر کے کام کاج سے

الرجک ہوتی ہیں جبکہ مجھ میں گھگر خواتین والے سارے جراثیم پائے جاتے تھے۔ مگر میرے ہاتھ میں جھاڑو دیکھ کر ممانک انتہائی سختی تھیں۔

”کبھی اسی شوق اور جذبے سے کتاب بھی پکڑ لیا کرو۔“ یہ طعنہ تو مہماؤن کوک زباں پر ہر وقت چلتا رہتا تھا۔ نجانے مہماؤن کیسی ماں تھیں۔ یعنی میں جو ایک شرا میڈ کی خدمات سر انجام دیتی تھی۔ ان کی ماما کے نزدیک اس کی کوئی ویلیو نہیں تھی۔

”ساجیہ مراد! میں آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ علم موسیقی اور آواز پر سائنسی دریافتیں کرنے والے سائنس دان کا نام بتاؤ جو کہ تیسری صدی ہجری میں بصرہ میں پیدا ہوا تھا۔“ مجھے سوچوں میں الجھا دیکھ کر غانی نے کافی ناراضی کے عالم میں اپنا سوال دہرایا۔

”تیسری صدی ہجری میں کون پیدا ہوا تھا؟“ میں نے یادداشت کے سارے خانے کھنگالنے شروع کر دیے تھے۔

”کون سی ایسی کھانے والی چیز کے نام سے ملتا جلتا نام تھا۔ علم موسیقی کو دریافت کرنے والے سائنس دان کا۔“ میں زیر لب بڑبڑاتے ہوئے سخت ٹینشن میں مبتلا ہو چکی تھی۔

”ساجی! غانی کے ضبط کا پیمانہ لبرز ہو گیا تھا اور میرے منہ سے اچانک لغتہ برآمد ہوا۔ ”شکر قدی“ یعنی الکندی۔“

”بھاڑ میں جاؤ تم۔ ایک سوال کے جواب میں ندرہ منٹ برادر کو دیے ہیں۔ پیپر میں نجانے تم کیا کرو گئی۔“ غانی درست جواب سن کر بھی منہ بھلائے بیٹھی رہی۔

”سوری غانی!“ میں نے بھی غلطی تسلیم کر کے معافی مانگنے میں دیر نہیں کی تھی۔

”آخری جواب بتاؤ، پھر جان چھوٹ جائے گی تمہاری۔ ویسے بھی ”کمر“ لگنے والا ہے۔“ غانی میری دلی کیفیات سے واقف تھی۔ تب ہی تو میرے فیورٹ ڈرامے کاڈ کر گیا تھا۔

”پوچھو“ میں نے شان بے نیازی سے جواب دیا۔
”حالت سکون سے چلنے والی کار کی ابتدائی ولاشی
کتنی ہوتی ہے؟“

”یہ ولاشی صفر ہوتی ہے۔“ میں نے بھی نظر بچا کر
کتاب میں سے ایک کر دیکھا اور جھٹ سے جواب
بھی دے دیا تھا۔ غالی کون سامیری طرف متوجہ تھی۔
اپنا ہینڈ بیگ کھولے بل کا پیکٹ نکال رہی تھی۔ سو
میرا بھی کام چل گیا اور آج ان ہی پھولٹی مٹی
”چوریوں“ کا خمیازہ قیل ہونے کی صورت میں بھگت
رہی تھی۔

ممانے کافی سوچ بچار کرنے کے بعد سر اٹھا کر میری
طرف دیکھا تھا اور پھر بولیں۔
”ساحہ! اتنا میں سمیٹ کر نیچے آجاؤ۔ میں تمہاری
پیکنگ کرنے لگی ہوں۔“

”مگر کیوں ممانے؟“ میں حیران پریشان ہی تو رہ گئی تھی۔
”تم نبیلہ کے پاس جا رہی ہو۔“ انہوں نے فیصلہ
کن انداز میں کہا۔
”پھوپھو کے پاس مگر کیوں؟“ اپنی بظلمت پٹ پٹ پھوپھو
کے پاس جانے کے متعلق سوچ کر ہی میں لرز اٹھی
تھی۔

”اس لیے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں
مانتے۔“
”مما پلیر!“ میں منمناتی رہ گئی تھی۔

”ڈیڈی! اما مجھے اسلام آباد بھجوانے لگی ہیں۔“
ڈائمنگ روم میں گھستے ہی میں نے دہائی دینا شروع کر دی
تھی۔ تائی امی یعنی بڑی ماما اور ڈیڈی (تایا ابو) آدھا
گھنٹہ پہلے ہی گھر آئے تھے۔ دونوں عدا بھائی کے بیٹے
کو دیکھتے کراچی گئے ہوئے تھے۔ عدا بھائی ڈیڈی کے
اکھوتے بیٹے تھے اور میں اپنے پاپا اور ماما کی اکھوتی بیٹی۔
بس یہی ہمارا مختصر سا خاندان تھا۔

عدا بھائی مجھ سے چندہ سال بڑے تھے۔ ان کی
شادی کو نو سال ہوئے والے تھے اور ان کے ہاں

تیسرے بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے دو ماہ
بعد بڑی ماما اور ان کی واپس آج ہی ہوئی تھی۔ اور
میرے بل ہو جانے والے کارنامے کے متعلق بھی
انہیں بتا چل چکا تھا۔

”سازہ! ہماری بیٹی کو اتنی دور مت بھجواؤ۔ بھلا اس
چنگتی مینا کے بغیر ہم رہا میں گے۔“ ڈیڈی فوراً جذباتی
ہو گئے تھے۔

”بھائی جان! اس تالائق کو نبیلہ ہی سدھار سکتی
ہے۔ شاید میٹرک میں یہ پاس ہو ہی جائے۔“ ماما بھی
جذباتی ہو گئی تھیں اور مجھے بھی کر دیا تھا۔

”مجھے آرٹس پڑھنے دیتیں تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔“
”زبان بہت چلتی ہے تمہاری۔“ دماغ کو بھی کبھی
زحمت دے لیا کرو۔ ”مما کو میرا بیچ میں بولنا قطعاً
نہیں بھلایا تھا۔

”سازہ! ساجی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ نیچے کاشوق اور
دلچسپی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“ ہیشہ کی طرح پاپا اور
ڈیڈی میری حمایت میں بولے تھے۔

”آپ کی ان ہی باتوں نے اس کا دماغ خراب کر
رکھا ہے۔“ ماما کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ میں نے ہمیں
برائی اور تکہ بولنے سے خوب انصاف کیا اور دعا پڑھ کر
اپنے کمرے میں چلی آئی۔

صبح ہر صورت مجھے اسلام آباد جانا تھا اور آج کی
رات میں جی بھر کر سونا چاہتی تھی۔ بد قسمتی سے میں
مما اور پاپا کی اکھوتی اولاد تھی۔ اگر ان کے اور بھی تین
چار بچے ہوتے تو شاید ماما کی توجہ بٹ جاتی۔ مگر ہمارے
خاندان میں بچوں کا فقدان تھا بلکہ قحط کتنا مناسب
ہوگا۔

اللہ بخشے وادی مرحومہ جب زندہ تھیں تو ماما اور
بڑی ماما کی ہر وقت شامت آتی رہتی تھی۔ انہیں اس
بات کا بہت قلق تھا کہ ان کی اولاد کی بہت کم اولاد ہے۔
بڑی ماما ایک بیٹے کی ماں تھیں۔ اسی لیے ان کی پلہ
بچت ہو جاتی تھی۔ البتہ میری ماما پر تو وادی کا اکثر و بیشتر
عذاب نازل ہوتا رہتا تھا۔

”سازہ! اس ”شیرنی“ کو پکیر کر کے گویا کے ٹوکا
پھاڑ سر کر لیا ہے۔“ وادی بھی میری اچھی صحت سے
خاصا جلتی تھیں۔ یہی حال نبیلہ پھوپھو کا تھا۔
”دماغ کو زحمت جو نہیں دیتی۔ اسی لیے گوشت
کا پھاڑ بنتی جا رہی ہے۔“

انہوں نے میرے بھرے بھرے سڈول سر لے کر
گوشت کے پھاڑ سے تشبیہ دے کر میرے نازک
جذبات کو بری طرح سے مجروح کر دیا تھا۔ اپنی تو صرف
دو ہی میٹھی سی تاؤ کی طرح لمبی، سوکھی پائیں جیسی دو
بیٹیاں تھیں اور ڈگریاں میرے حصے کی بھی انہیں کر
رہی تھیں۔ اس طرح کے رویوں کی میں بچپن سے
ہی عادی تھی۔ میری صحت اور تعلیم یہ دو ایسے مسئلے
تھے جو میرے خاندان والوں کے لیے مسئلہ فلسطین بن
چکے تھے۔ نہ تو میں ماما، وادی اور پھوپھو کی خواہش کے
مطابق اپنی صحت و دانشنگ کے شوق میں تباہ کر سکتی
تھی اور نہ ہی میٹرک میں مجھ سے پاس ہوا جا رہا تھا۔ یہ
دونوں کام یوں لگتا تھا جیسے میرے اختیار سے باہر ہیں۔
کھانا پینا پھوڑ کر میں کیسے ٹی بی کی مریضہ بن سکتی
تھی؟

”سوکھی سڑی ہڈیوں کی ڈھانچہ سی ساجہ مراد بھلا
کیسی لگتی؟“ یہ سوچ ہی مجھ پر کچھ طاری کر دیتی تھی۔
سو میں ڈٹ کر تینوں وقت کا کھانا کھاتی تھی۔ ماما کی
گھوڑیوں کی پرواہ کیے بغیر۔ اور رپاڑ بھائی کا مسئلہ۔ تو
شاید کسی نہ کسی طرح میرا میٹرک میں اے پس آجاتا
اگر ماما مجھے آرٹس پڑھنے دیتیں۔ شاید اس وقت میں
اردو ادب یا فائن آرٹ میں اپنا نام بنا چکی ہوتی۔ مگر
ہائے میری قسمت، مجھے تو ابھی تک برقی کرنٹ اور
مقتناطیسیت کے درمیان تعلق کو معلوم کرنے والے
کا نہیں پتا تھا کہ وہ فلیمنگ ہے نیوٹن ہے غیراڈلے
ہے یا پھر اور سڈلے۔

اپنی تازہ ترین بے عزتی پر میں جی بھر کے تمللا
رہی تھی۔ اس تمللا ہٹ نے تو زندگی بھر میرے ساتھ
ہی رہنا تھا اور اب جو نبیلہ پھوپھو کے پاس بھیج کر مجھ

بے چاری پر ظلم کے پھاڑ توڑے جا رہے تھے مگر بھلا
ہو میرے پیارے ڈیڈی کا۔ انہوں نے صبح صبح ناشتے
کی میز پر ایک جذباتی تقریر کر کے ماما کے ارادوں کو
ڈانواں ڈول کر دیا تھا۔ تب ہی تو ممانے شمو کو میری
پیکنگ کھولنے کا آرڈر دے کر مجھے حد سے زیادہ مسرور
اور شاد کر دیا تھا۔

ڈیڈی کی بے پایاں محبت پر پہلے بھی مجھے شک
نہیں تھا مگر اب تو اس محبت پر گویا مہر لگ چکی تھی اور
ادھر ڈیڈی میرے کان میں کہہ رہے تھے۔

”ان دونوں خواتین کے ہاتھ سے بندہ مڑا کھانے
کھا کر ہم نے بھلا مرنا تھا کیا؟ مجھے اپنی بیٹی کے ہاتھ سے
بنی کافی پیسے بغیر بند بھلا آسکتی تھی؟“
”مگر ڈیڈی! یہ فرکس اور فرسٹری۔“ میں رو دینے کو
تھی۔

”ارے، چولے میں جھوٹو فرکس کو۔ کوئی
ضرورت نہیں، تنھی سی جان کو غم لگانے کی۔ اگلے
سال آرام سے پیپو دے لیتا۔“

پاپا نے لا پرواہی سے میرے شانے تھپتھپائے
ایسے ہی تو میں اپنے پاپا اور ڈیڈی کے گیت نہیں گاتی
تھی۔ انہوں نے بھی مجھے مایوس ہونے نہیں دیا تھا۔
ان کی ایسی ہی محبت کی وجہ سے میں ابھی تک میٹرک
میں اعلیٰ ہوئی تھی۔ دراصل رزلٹ آنے کے بعد ماما
مار کٹائی کا پیرینڈ لیں تھیں۔ اور پھر میں تین چار گھنٹے
سوگ کی کیفیت میں گزار دیتی تھی پھر میری سوچی سوچی
آنکھیں دیکھ کر ڈیڈی اور پاپا جی جان سے میری بہت
بندھاتے تھے۔ ان سے میری ایشوریہ رائے جیسی
مونی مونی آنکھوں میں آنسو جو نہیں دیکھے جاتے تھے۔
”ساجی! انیشن نہیں لیتا بیٹا!“ مگر تے ہیں شہسوار
ہی میدان جنگ میں۔“ تم ایک دفعہ پھر کو خوش کرو،
محنت کرو۔“ یہ ڈیڈی کے الفاظ ہوا کرتے تھے اور ماما
سچا ہو جاتی۔

”بھائی جان! آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں، یہاں
ٹینشن، لی نہیں دی جاتی ہے۔“

”مگر یہ ٹینشن کتنی تو اس کا طول اور عرض اتنا پھیلا ہوا نہ ہوتا۔“ اسود بھائی بھی میری ”صحّت“ کے دشمنوں میں سے تھے۔
 ”ہونہ“ خود بڑے اسرارٹ ہیں۔“ میں نے ناک چڑھائی۔

”بک بک سن لو بس۔“ مماغھے سے بولیں۔ ”جاؤ“ اسود کے لیے چائے بنا لاؤ۔“

”کلام کے وقت ساجیہ یاد آجاتی ہے۔“ میں کہنے سے باز نہیں آئی۔ ”فری سے کہیں چائے بنا لائے۔“ میں نے شان بے نیازی سے کہا۔

”مجھے جو شانہ نہیں پتا۔“ اسود بھائی نے ناگواری سے کہا۔ ”ساجی کے علاوہ کوئی اچھی چائے بنا ہی نہیں سکتا۔“ اب وہ میری تعریف کر رہے تھے۔ جسے میں سراسر خوشامد سمجھ رہی تھی۔
 ”مسک مت لگا لیں۔“

”یہ مسک کیا ہوتا ہے؟“ وہ حیران ہوئے۔ ”اک بات تو سچ ہے۔ میری بسن سے اچھی کوئی چائے بنا ہی نہیں سکتا۔“

”ہن۔“ صدے کی شدت سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ نجانے ہر خوبصورت اور قابل لڑکے کو میں ہن ہی کیوں لگتی تھی۔

اگر شادی ہو جاتی تو کم از کم پڑھنا تو نہ پڑتا۔ اور میں واحد ایسی لڑکی تھی جو اپنے لیے بھرے پرے کھانے پینے کے شوقین سرسالی کی دعائیں مانگتی تھی۔ جنہیں کھانے پینے میں اپنا کردیہ بناتی اور کم از کم وہ مجھ سے میری ڈگریوں کے بارے میں نہ پوچھتے۔

مما کے نزدیک میں ساری دنیا کی لڑکیوں سے زیادہ نالائق، جاہل اور کندہ بن تھی۔ مگر دل ہی دل میں وہ میرے کچھ داپے کی قائل ضرور تھیں۔ میں ہر فن میں طاق تھی اور میرے سکھانے کا سارا کریڈٹ بڑی ماما کا تھا۔ انہوں نے مجھے کوئنگ سے لے کر سلائی کڑھائی تک، ہر فن میں طاق کر دیا تھا۔ مگر ماما کے نزدیک میری ان خوبیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ

”ویلے لوگوں کے سپاے“ کہہ کر میری ان خوبیوں کو مٹی میں رول دیتی تھیں۔
 ”ساجی! ایک تو تم نجانے کس مراقبے میں چلی جاتی ہو۔“ ماما نے حق سے کہا۔ ”اب اٹھ بھی چکو۔“
 ”جاری ہوں۔“ میں دھپ دھپ کرتی پکن میں چلی گئی۔



میں بڑے شوق اور جذبے کے ساتھ فٹ کری بنا رہی تھی۔ مچھلی کو تین لگا کر پہلے سے رکھ دیا تھا۔ پیاز بھی گولڈن کر لی تھی۔ فٹ بھی فرانی ہو چکی تھی۔ بس آدھے گھنٹے کا کام تھا۔ ساتھ ساتھ اٹالین سلاڈ کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ یہ مینو ڈیڑی کی پسند کے مطابق صبح ہی میں نے ترتیب دیا تھا۔ کوفہ بریانی دم پر تھی۔ اسی بل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں وقتاً فوقتاً سلیب پر رکھے نوٹس پر بھی نگاہ ڈال رہی تھی۔

”ف“ اب فون سننے لاؤں میں جاؤں۔“ میں نے بھنا کر سوچا۔ فون بے چارہ بچ کر خاموش ہو گیا تھا۔ تب ہی ماما اور بڑی ماما تنگ روم سے پر آمد ہوئیں۔ نجانے کون سی میٹنگ کر کے فارغ ہوئی تھیں۔
 ”کس کا فون تھا ساجی!“

”ابن اہنیم کا ہوگا۔“ میں نے رٹا لگاتے ہوئے سلاڈ کے لیے خروڑہ کاٹنا شروع کر دیا۔

”ہیں۔ وہ کون ہے؟“ بڑی ماما بے حد حیران ہوئیں۔ فون کی گھنٹی پھر سے بجنے لگی تھی۔ بڑی ماما ابن اہنیم کے متعلق تفصیل پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئیں۔ کچھ دیر بعد مجھے بڑی ماما کی افسردہ سی آواز سنائی دی۔

”کچھ بعد آئیں گے۔ کسی گھریلو پر اہلم کی دم سے ان کا پروگرام ملتوی ہو گیا ہے۔“

”اس کے نصیب ہی ٹھنڈے ہیں۔“ ماما کی منتظر اور شدید پریشانی میں ڈوبی آواز سنائی دی تو میں نے چونک کر ان دونوں خواتین کے منتظر چروں کی طرف دیکھا۔

کس کے نصیب ٹھنڈے ہیں۔ یہ پوچھنے کی ضرورت تو نہیں تھی۔ ماما کا اشارہ یقیناً ”میری ذات گرامی کی طرف تھا۔ شاید کچھ مہمانوں کو آتا تھا اور اب ان کا پروگرام بدل گیا تھا۔ یقیناً“ انہیں بھی میرے مونا پنے کی بھنگ پڑ چکی ہوگی۔ ایسا ایک دو مرتبہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔

میری ذات کے ساتھ بے شمار مسائل کا انبار بھی جڑا ہوا تھا۔ ایک تو میری نالائقی، دوسرا میرا پھیلا ہوا وجود۔ تیسری یہ گز بھر لمبی زبان جو نئے نئے مہمانوں کو دیکھ کر منہ کے اندر رکھتی ہی نہیں تھی۔ کبجنت تیز گام کی طرح چلتی جاتی تھی۔

پچھلے دنوں کچھ خواتین آئی تھیں۔ میرے گورے بچے خوب بھرے بھرے سراپے کو کھانے والی نظروں سے دیکھتی رہیں۔ بعد میں کلا بھیجا، انہیں آنے کی پوری نہیں چاہیے۔ بس مجھے بھی غصہ آگیا۔ بڑی ماما کی پرست و ڈاری میں سے ان خواتین کا فون نمبر چرا کر وہ نئے لیے کے یاد ہی کرتی رہیں گی تمام عمر اس شاندار بے عزتی کو۔ ساجیہ مراد کو آنے کی پوری کہنے کا خمیازہ بھگتنا تو تھا ہی۔ میں نے بھی ان کے گتے بیٹے کی شان میں ایسے ایسے القابات کہے تھے کہ بے چاری تمام عمر جلتی بھتی رہیں گی۔

یہ دوسری منحوس ترین ٹیلی فون کال تھی۔ جو میری زندگی میں بھونچال لانے کا باعث بنی۔
 ماما کی پریشانی نے مجھے بھی بچ بچ پریشانی کر دیا تھا، مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ماما کو ان دنوں مجھے پڑھائی کی افادیت پر لے کے لکچر دینے کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔ دوسرا حیرت کا جھکا مجھے تب لگا۔ جب آرس کی کتابیں میری رائٹنگ ٹیبل پر سج گئیں۔ ماما نے اپنی ضد چھوڑ دی تھی۔ ان دنوں کے سرے سے مجھے ڈھیر سارا پڑھانے کا بھوت اتر چکا تھا۔ اب وہ مجھے سلم اینڈ اسارٹ دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے سلمنگ سینٹر کی میڈم سے بات بھی کر لی تھی۔

ادھر میرے پکن میں گھنے پر شدید باندی لگ چکی تھی۔ میں اپنے پسندیدہ بجلیکٹ دیکھ کر اس قدر خوش نہیں ہوتی تھی، جس قدر پکن میں گھنے پر باندی نے مجھے ادھ موایا تھا۔ ماما مجھے صبح پانچ بجے کا پید مز پانی پلا کر دیے کی ایک چھوٹی سی پیالی پکڑا دیتی تھیں۔ تین دن اس ناانسانی اور ظلم کے بعد میں نے اپنے زرخیز دل سے کچھ نئی ترکیبیں نکال لی تھیں۔ کبھی ڈیڈی اور بھی بیابا سے دو تین سو روپے لینا میرا معمول بن گیا تھا۔ کیونکہ ماما اور بڑی ماما نے مجھے دبلا کرنے کے لیے جو عہد کر رکھا تھا، اس عہد کو مد نظر رکھ کر میری پانکٹ مٹی بھی بند ہو چکی تھی۔
 اب ماما مجھے پڑھائی پر نہیں بلکہ ڈانٹنگ پر بڑے بڑے اور بے لکچر دیتی تھیں۔
 ان دنوں ماما کی سب سے بڑی ٹینشن میرا برہنہ ہونا وزن تھا۔
 جس دن میرا میٹرک کا شاندار رزلٹ آیا، یہ اسی دن کی بات ہے۔ یہ دن میرے لیے خوشگوار نہیں تھا۔ حالانکہ ماما اور بڑی ماما میرے پھولے پھولے گلانی چہرے پر نہ جانے کتنے ہی بوسے دے چکی تھیں۔ ماما میرے اچھے رزلٹ پر پھولے نہیں ساری تھیں۔ اور ڈیڈی فخریہ کہہ رہے تھے۔
 ”میں نہ کتنا تھا سارا، ساجی کو آرس پڑھنے دو، بچے کی دلچسپی اور شوق کو اولیت دینا چاہیے۔“ ماما آج ڈیڈی سے متفق ہو چکی تھیں۔ انہوں نے کسی بھی قسم کی بحث نہیں کی تھی۔
 رات کو خالہ نے ماما کو فون کر کے بتایا۔
 ”تیا! بڑی تیا نے اسود کے لیے غائبہ کو مانگا ہے۔“
 اس خبر نے ماما کے چہرے کے سارے رنگ اڑا دیے تھے۔ شاید وہ بھی اسود بھائی کو بطور داماد پسند کر چکی تھیں۔ تاہم بھانجی کی خوشی پر انہوں نے کم طرفی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ پہلے چھوٹی خالہ کو اور پھر بڑی خالہ کو مبارکباد دی۔
 ادھر میرے ارمانوں پر بھی اوس پڑ چکی تھی۔ غائبی اور اسود بھائی سے اچھے اچھے گفتگوں وصول کر کے

میں نے بھی اوپر ہی دل سے انہیں مبارکباد دی۔ اگر اسود بھائی کے ساتھ بات بن جاتی تو میں نے ایف اے کے بجائے شادی کرنا تھی۔ مگر بے میرے نصیب۔ جو بقول ماما کے بالکل برف یا آکس کریم کی طرح ٹھنڈے تھے۔

خاندان کے سارے ہی لڑکے ایک ایک کر کے کھوئے۔ سب بڑھ چکے تھے۔ حنا اور صبا جیسی نانا کی لڑکیاں بھی دو دو بچوں کی اماں بن چکی تھیں۔ میرا دل جل جل کر خاک ہو رہا تھا۔ اور ادھر اسود بھائی اور غالی کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔

مما بھی ہنسی خوشی کبھی جینو تو کبھی بری کی شایگ کروانے چلی جاتی تھیں۔ بچن ان دنوں میرے صحت مند کندھوں پر تھا۔ سو میں جی بھر کر چٹ پٹے کھاؤں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

ڈیڈی اور پاپا بھی خوب مزے کر رہے تھے۔ ان دنوں دونوں کو پریز بھول چکا تھا۔ میں بھی فراموشی لسٹ کو دیکھتے ہوئے مینو ترتیب دیتی تھی۔

بڑی ماما تو عرصہ ہوا کچن کو خیر یاد کہہ چکی تھیں۔ ہائی بلڈ پریشر کے مرض نے انہیں خاصا عاجز کر دیا تھا۔ اور

مما کو بھی میں اب کم کم ہی کچن کی طرف جانے دیتی تھی۔ مگر جب سے ماما کو میرے پھیلنے وجود کو دیکھ کر شاک لگا تھا اور میرا اب تک رشتہ نہ ہونے کی یہ بہت بڑی ”وجہ“ معلوم ہوتی تھی تب سے بچن میں میرے داخلے پر پابندی لگا دی گئی تھی مگر خیر اب تو آزادی ہی آزادی تھی اور میں اس آزادی سے خوب فائدہ اٹھا رہی تھی۔

شادی کے ہنگامے جوں ہی سرور بڑے ماما نے میرا دوبارہ وزن کروایا اور پھر کچھ مدت پوچھنے میں اپنا پندرہ کلو وزن بڑھا چکی تھی۔ ماما نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔

میں نے انٹر میں ایڈمیشن کیا لیا مصروف سے مصروف تر ہوئی چلی گئی تھی۔ پڑھائی اور کھانے کے علاوہ مجھے کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ بڑی ماما کے میں داخل ہوئیں۔

”سناؤ! بانو کی روحی کار شہ پہلی ہو گیا۔“ یہ خبر خاصی روح فرسا تھی۔

”اچھا۔“ ماما صدمے کے مارے بول ہی نہ سکیں۔ ”اچھی خاصی موتی اور سالوں سی بھی مگر پوزیشن ہولڈر تھی۔ عمر کچھ زیادہ ہو گئی تھی اسی لیے بے چاری بانو بہت پریشان تھی۔“ ماما نے میری طرف دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری۔

”چلو! بانو کی پریشانی تو دور ہوئی۔ اللہ سب کی بیٹیوں کے نصیب اچھے کرے۔“ بڑی ماما نے صدق دل سے دعا کی۔ نظرس ہنوز مجھ پر تھیں۔ گویا خصوصاً ”میرے لیے بھی دعا کی گئی تھی۔“

”روحی باجی کی شادی میں کون جائے گا۔“ مجھے اپنے کپڑوں کی فکر ہو گئی تھی۔ سوبے نابی سے پوچھنے لگی۔

”تم تو ہرگز نہیں جاؤ گی۔“ ماما کا انداز فیصلہ کن تھا۔

”کیوں؟ اب تو میں میٹرک بھی کر چکی ہوں۔“ میں نے روٹی صورت بنا کر کہا۔

”بڑا تیرا ریا ہے تین سال میں میٹرک کر کے۔“

ماما تو سالوں کی طرح طنز کرنے میں ماہر تھیں۔ ”کر تو لیا ہے نا۔ اگر اس دفعہ بھی ٹیل ہو جاتی تو اچھا تھا۔“ میں گھس کر بولی۔

”بے وقوف! حق! ذرا عقل نہیں۔ اگلے گھر جا کر نچالنے کون کون سے ”گل“ کھلائے گی۔“

”مجھے گل کو منہ لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کو اچھی طرح سے خبر ہے میں ”گل“ سے کس قدر چڑتی ہوں۔“ گل ہماری ریڈن تھی پاپا کے دوست کی بیٹی۔ ان دنوں چھٹیاں گزارنے کینڈا لگی ہوئی تھی۔



میں اس وقت ٹیئرس پریٹھ کر کیلوں کے ساتھ معمولی سا انصاف کر رہی تھی۔ صرف چھ کیلے ہی کھائے تھے۔ جب میری ریڈن کے ٹیئرس کی ریٹنگ

بچکے ایک ساہ چمکتی آنکھوں والے خوب لڑکے نے مجھے ساتواں کیا اٹھاتے دیکھ کر گویا گنتی مکمل کر دی تھی۔

”اب مزید ایک بھی کیلا مت کھانا۔ ورنہ تمہارا نہ سہی، میرا اپنا معدہ تمہیں کیلے کھاتے ہوئے دیکھ کر پھٹ جائے گا۔ مانی گا! بیٹے کہہ کہ کواں! ابھی دو سرخ سرخ سیب بھی پلیٹ میں ڈھک کر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کسی اور کے معدے میں ڈالو گی؟“ وہ مسلسل بولتا ہوا بڑی بے تکلفی کے ساتھ ہمارے ٹیئرس پر کود گیا۔ یہ کلمے سب تو مجھے ہضم ہو سکتے تھے مگر ان خترم کی بے تکلفی ہر گز نہیں۔

”کون ہو تم؟“ میں نے اسے انڈی رُ جلال موڈ میں دباؤنے کی کوشش کی تھی مگر گھر میں کافی تکلیف دہ خراشیں پڑ گئیں۔

”میں دلوں کا کیف ہوں۔“ مقابل نے خاصا جھوم کر بتایا۔

”میں کہہ رہی ہوں! اپنا نام بتاؤ؟“ مجھے ایک دفعہ پھر تلخ لہجہ بنانا پڑا۔

”بتایا تو ہے۔ کیف ہوں، سرور ہوں، نشہ ہوں، خمار ہوں۔ مستی ہوں۔“ وہ پھر سے دلا بھرے انداز میں بولا۔

”یہ سارے نام تمہارے ہیں؟ احمق! مجھے صرف ایک نام بتاؤ۔“ میں نے جھاڑ کر ملامت دراصل میرا ارادہ یہ تھا کہ ریٹنگ بھلا نک کر ذرا خسانہ آئی (گل کی می) سے شکایت لگا کر آئی ہوں کہ گھر میں کس بدتمیز مہمان کو رکھا ہوا ہے۔ جو بغیر اجازت کے دوسروں کے گھروں میں گھس کر بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا ہے۔“ خسانہ آئی تمہاری رشتے میں کیا لگتی ہیں۔“ میں نے آنکھیں دکھا کر پوچھا۔

”ڈیڈی کی بسن۔“

”یعنی تمہاری پھوپھو؟“

”یہی سمجھ لیں۔“ اب وہ ریٹنگ کے اوپر جھک کر ہمارے لان کا جائزہ لے رہا تھا۔

”یہ پھول پودے کس نے لگائے؟“

میں بچپن سے ہی ماما کے ظلم و جبر کا نشانہ بنتی رہی ہوں۔ ظاہر ہے، انکوئی تھی۔ سارے ستم مجھ مسکین

”ساحیہ نے۔“ میں نے سوچا کیوں نہ تعریف ہی ہو رہی جائے۔

”یہ کون خاتون ہیں؟“ وہ چونک کر پوچھنے لگا۔

”میں اور کون۔“

”اوه، تو آپ کا نام ساحیہ ہے۔“ اس نے آنکھیں سکڑ کر میری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ”آپ کا نام تو کوئی بھاری بھر کم قسم کا ہونا چاہیے تھا۔ دروانہ، سطوت آرایا ہزیرہ بیگم۔“

”کیا مطلب؟“ میں چیخ اٹھی۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ کوئی میری صحت پر چوٹ کرے تو میں زخمی شیرنی بن جاتی تھی۔ کچھ میں فطرتاً جھگڑا لو تھی۔

دراصل اس کے پیچھے بھی بے شمار وجوہات ہیں۔ میرے گھروالوں کی بے شمار زیادتیاں اور ظلم جو عمر کے مختلف ادوار میں مجھ پر ٹوٹے رہے تھے۔ شروع سے ہی مجھے ہر بات پر ڈی گریڈ کرنا۔

میں جو عماد بھائی کے اتنے سالوں بعد اس ظالم گھرانے میں پیدا ہوئی تو ان لوگوں کو میری قدر کرنا چاہیے تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ لوگ شکرانے پڑھتے، نیازیں مانگتے، مگر ہوا کچھ یوں۔۔۔ ماما مجھ جیسی جنتانی بچی کو پیدا کر کے بیمار پڑ گئی تھیں۔ سارے گھر والے معصوم سی گول گو تھیں بچی کو بھول بھال کر ماما

کے غم میں ادھ موئے ہونے لگے۔ پاپا نے تو اس وقت جذبات میں آ کر یہ تک کہہ دیا تھا۔ ”اس سے بہتر تھا، میں بے اولاد ہی رہتا۔“ یہ اس نازک گھڑی کی جذباتی سی کیفیت تھی۔ بعد میں پاپا نے مجھے اپنی آنکھوں کا ستارہ اور ہتھیلی کا چھالا بنانا چاہا تو میری ہلکے ماما درمیان میں کود پڑیں۔

”مراد! کیا ساسی کو بگاڑ دوس گے۔ ایک ہی ہماری بیٹی ہے۔ اس کی تربیت میں چوک نہیں ہونی چاہیے۔“

ماما نے دو سال کی عمر میں تربیت کرنے کے چکر میں مجھے جو خونخوار نظروں سے گھورتا شروع کیا تو اب تک یہی سلسلہ چلتا آ رہا ہے۔

میں بچپن سے ہی ماما کے ظلم و جبر کا نشانہ بنتی رہی ہوں۔ ظاہر ہے، انکوئی تھی۔ سارے ستم مجھ مسکین

میں نے اپنی ساسی کو بگاڑ دوس گے۔ ایک ہی ہماری بیٹی ہے۔ اس کی تربیت میں چوک نہیں ہونی چاہیے۔“

ماما نے دو سال کی عمر میں تربیت کرنے کے چکر میں مجھے جو خونخوار نظروں سے گھورتا شروع کیا تو اب تک یہی سلسلہ چلتا آ رہا ہے۔

میں بچپن سے ہی ماما کے ظلم و جبر کا نشانہ بنتی رہی ہوں۔ ظاہر ہے، انکوئی تھی۔ سارے ستم مجھ مسکین

میں نے اپنی ساسی کو بگاڑ دوس گے۔ ایک ہی ہماری بیٹی ہے۔ اس کی تربیت میں چوک نہیں ہونی چاہیے۔“

ماما نے دو سال کی عمر میں تربیت کرنے کے چکر میں مجھے جو خونخوار نظروں سے گھورتا شروع کیا تو اب تک یہی سلسلہ چلتا آ رہا ہے۔

میں بچپن سے ہی ماما کے ظلم و جبر کا نشانہ بنتی رہی ہوں۔ ظاہر ہے، انکوئی تھی۔ سارے ستم مجھ مسکین

پر ہی ڈھائے گئے۔ عمارتھائی ایک تو مجھ سے بہت بڑے تھے۔ اوپر سے بلا کے فرماں بردار۔ مجھے دیکھ دیکھ کر تو ماما کو ہول پڑتے تھے۔

”ہائے لڑکی ذات اور ایسی بد زبان۔ بولتی ہے تو گویا چھت پھاڑنے کے ارادے سے۔ کبھی عمار کو اونچی آواز میں بات کرتے دیکھا ہے۔“

ماما کا خیال تھا قصور میرا بھی نہیں عین اپنی پھوپھی کا مزاج چرا لاتی ہوں۔ سو میری گرم مزاجی سے گھر

والوں نے سمجھو تا کر لیا تھا۔ بس یہی وجہ تھی کہ میں۔۔۔ ”محترمہ! آپ کس مراقبے میں چلی گئی ہیں؟“ وہ بالکل میرے سامنے اکھڑا ہوا تھا اور میں جو ماضی کی بھول بھلیوں میں گم بچپن سے اب تک اپنے ساتھ کی جانے والی زیادتوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایک دم چونک کر خونخوار نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو؟“ جوں ہی میری نظر اس کے ہاتھوں تک گئی۔ میرا پارہ چڑھ گیا۔ وہ کمینہ لیوں کے رس میں کئے ہوئے سیب چٹ کر گیا تھا۔

”کس کی اجازت سے تم نے میرے سیب کھائے ہیں؟“

اس نے میز سے ایک ٹشو بھی اٹھا لیا۔

”جاؤ یہاں سے۔۔۔ ورنہ میں چوکیدار کو بلا لاؤں گی۔“

میں نے اسے دھکا چالایا۔

”چوکیدار نے بھلا یہاں آکر کیا کرنا ہے؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”تمہیں اٹھا کر دوسرے ٹیرس پر پھینک دے گا۔“

”اس میں اتنی جان ہے؟“ وہ ہمارے چوکیدار کی صحت پر چوٹ کر رہا تھا۔ ”یہ کام تو آپ پر سوٹ کرنا ہے اور آپ ماشاء اللہ سے کڑھی سکتی ہیں۔“

”کون سا کام؟“

”اب کیا تفریح کروں۔ خیر! اللہ آپ کو نظرد سے بچائے۔“ وہ بیک وقت میرے صحت مند سراپے پر بھی چوٹ کر رہا تھا۔ یہاں میرا غصہ کرنا تو بیٹا تھا اور غصہ چونکہ میری ناک پر دھرا رہتا تھا، سو میں فوراً ہی پھٹ پڑی۔

”جاتے ہو یہاں سے کہ میں ماما کو بلاؤں؟“

”انتا تردد کر کے نیچے جانا ہے تو میرے لیے چائے بھی لیتی آنا۔ میں یہیں ویٹ کر دوں گا۔“ اس نے بڑی دوستانہ مسکراہٹ سجا کر کہا۔

”تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ میں نے چھری اور پلیٹ اٹھا کر کہا۔

”گورنہ جاؤں تو۔۔۔؟“

”تم کس کی اجازت سے ہمارے ٹیرس پر آئے ہو؟“

میں نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔

”میں نے دل کی اجازت سے۔“ وہ مزے سے بولا اور پیر جھلاتا کھڑا ہو گیا۔

”مس ساجیہ مراد! ہم پھر ملیں گے ابھی چلتا ہوں۔ آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔“ وہ دوسرے ہی پل ریڈنگ سے کود کر دوسری طرف چلا گیا تھا۔ جبکہ میں بھناتے ہوئے نیچے اتر آئی۔

☆ ☆ ☆

میرا ایف اے میں پاس ہو جانا میرے گھر والوں کے لیے ہفت اقلیم کی دولت مل جانے کے برابر تھا۔ ڈیڈی

پاپا اور ماما تو اس خوشی میں کسی بڑی ضیافت کا اہتمام کرنا چاہتے تھے مگر نبیلہ پھوپھو کی بیماری کی خبر نے سارا پروگرام دھم دھم کر دیا تھا۔

میرے اور ڈیڈی کے علاوہ سب ہی اسلام آباد چلے گئے تھے۔ ڈیڈی کو آفس سے چھٹی نہیں ملی تھی اور

میں ڈیڈی کی وجہ سے گھر میں رہنے کے لیے تیار تھی۔ ویسے بھی میں پھوپھو کے سوالات کا سامنا کرنے سے

گریزاں تھی۔ انہوں نے تو میرا ناک میں دم کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

”سائنس کیوں نہیں پڑھی؟ ایڈمیشن کیوں نہیں لیا؟ کون کون سے سبجیکٹ پڑھو گی؟“

اب بھلا پھوپھو کو کون بتائے۔ میں نے مزید نہ پڑھنے کا اعلان کر دیا تھا اور میری پیاری ماما نے اس اعلان کو سن کر فی الحال جوتا اٹھانے سے پرہیز ہی کیا تھا۔ دراصل میرے انٹرنل پاس ہو جانے کی خوشی میں انہوں نے اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہا تھا۔ اور

فی الحال میری بے عرقی کرنے کا ارادہ ترک کر کے اسلام آباد سدھاری تھیں۔

چونکہ پڑھائی کا بوجھ تو ہٹ چکا تھا۔ سو میری آج کل تمام تر توجہ کا مرکز ٹی وی اور یکن تھا۔

اس دن بھی میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ڈیڈی کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ اس کی ترکیب میں نے ایکسٹری چھین کی آئی سے سیکھی تھی۔

میں مختلف مسالوں کے پیسٹ کو چپٹی کی ہوئی چائے کے اوپر لگا لگا کر فرانی کر رہی تھی جب شمو نے مجھے یکن میں آکر اطلاع دی۔

”ساجی بی بی! مہمان آئے ہیں۔“

”کوئی؟ اس وقت کون ویلا (فارغ) آگیا ہے منہ اٹھا کر۔“

میں لال مرچ پاؤڈر گرم مسالا اور زیرہ کریم میں مکس کر رہی تھی۔ چائے کو مسالوں میں لگانا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے ہاتھ دھوئے اور سر پر ٹنگی شمو کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”کون ہے؟“

”خود دیکھ لیں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے آنکھیں دکھائیں۔

”دیکھنے کی چیز ہے قسم سے۔“ شمو اپنی اوقات پر اتر آئی۔

”کیون نہیں۔“ میں نے اسے ڈپٹ کر کہا۔ ”مہمان کو ڈراؤنگ روم میں بٹھالیا ہے؟“

”جی بالکل۔“ اس نے زور سے سہلایا۔

”تو پھر چائے لے آنا۔“ میں لاؤنج میں لگے مرر

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

میں اپنا حلیہ دیکھ کر بولی۔

”چائے کے ساتھ کیلاؤں جی؟“

”نگھنسیں رول گلاب اور ہاں ایک بھی رکھ لینا“

ڈیڈی کے کوئی دوست ہی ہوں گے۔ میں نے اندازاً سوچتے ہوئے ڈراؤنگ روم کا رخ کیا تھا، مگر صوفے پر موجود شخصیت کو دیکھ کر میرے منہ میں گویا کڑوے بادام آگئے۔

”تم۔۔۔؟“ میں صرف اتنا ہی کہہ پائی۔

”جی میں۔۔۔ آپ کیوں شاکدہ نہ گئی ہیں؟ یہاں بیٹھ جائے، کہیں گرمیت جائے گامدے کی شدت سے۔“ وہ اخلاقاً اٹھتے ہوئے بولا۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ میں ناراضی سے بولی۔

آج بہت دن بعد میں نے اسے دیکھا تھا۔ شاید بیچ کے دنوں میں وہ کہیں چلا گیا تھا۔

”مبارک باد دینے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”ہائے“ اسے بھی خبر ہو چکی۔ ”میرا دل ڈوب کر ابھرا۔“ پھر نمبر بھی جان چکا ہو گا۔

”انتا حیران کیوں ہو رہی ہیں۔ دراصل مجھے رخسانہ آئی نے بتایا تھا۔ سوچا، مبارک دے آؤں۔ ایمان سے بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر کے آپ نے انٹریس کر لیا ہے۔“ وہ بیچ بیچ بڑی خوشی کا مظاہرہ کر رہا تھا مگر مجھے صاف طنز ہی لگا۔

”ٹھیک ہے، خیر مبارک۔“ میں نے اوپری دل سے کہہ ہی دیا۔ ”ویسے تم اتنے دن سے کہاں تھے؟“

نظر نہیں آئے۔ میں نے ایسے ہی بات بدھانے کی غرض سے پوچھ لیا تھا۔

”آپ نے مجھے کس کیا؟“ وہ تو ایسے کھل اٹھا تھا

گویا گلاب کا پھول ہو۔

”لو، جی! اگر لوکل۔۔۔ یہاں تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ میں نے منہ بنا کر سوچا، مگر اس کا دل تو بڑا بھی مناسب نہیں تھا، سو لفظوں کا ہیر پھیر کر کے بولی۔

”ٹیرس پر نہیں دیکھا سو اس لیے پوچھ لیا۔“

”دراصل میں کچھ دن تک ”سوگ“ کی کیفیت

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

میں رہا ہوں۔

”سوگ؟“ میں چونکی۔ ”بھلا کیسا سوگ؟ کیا ہوا؟ کسی نے کچھ کہہ دیا؟“ میری تجسس پسند فطرت انگڑالی لے کر جاگ اٹھی تھی اور فوری طور پر میرے ذہن نے ایک کہانی کا تانا بانا بھی بن لیا تھا۔ گل کے پیار میں پاگل لیکن۔۔۔ گل کا ہری جھنڈی دکھانا اور پھر کیف کا سوگ میں اتنے دن غمزہ رہنا۔۔۔ اور میرے اندر مارے تجسس کے گدگدی ہونے لگی تھی اور میں بس قیافہ ساری کہانی کو جاننے کے لیے بے چین ہو گئی تھی اور اس لمحے مجھے بھول گیا تھا کہ میری پہلی ملاقات کافی ناگوار رہی تھی۔

”بس جی، کچھ نہ پوچھیں۔۔۔ لوگوں کے دورنے چرے ہیں۔“ وہ رنجیدگی سے بولا۔

”کس کے؟“ میں حیران ہوئی۔

”ہماری پھوپھو محترمہ۔“ وہ جل بھن کر بولا۔

”مگر ان کے دو چرے کہاں ہیں؟ مجھے تو صرف ایک چروہی دکھائی دیتا ہے۔“ میں نے ہونٹ پن کی اتھا کر دی تھی۔

”میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں۔“ وہ جھنجھلایا۔

”یہ جو میری پھوپھو ہیں نا۔۔۔ ایک نمبر کی بد عہد ہیں۔“ وہ خوب جلا بیٹھا تھا۔

”انہوں نے کیا کیا؟“

”پھوپھو نے کہا تھا ان پچھیلوں میں وہ ضرور ہمارے گھر رہنے کے لیے آئیں گی مگر اب وہ مگر گئی ہیں۔“ کیف نے بسور کر بتایا تھا اور ادھر میرا منہ اتر گیا۔ جو کچھ میں سننا چاہتی تھی اور جس محبت کی کہانی کا مجھے انتظار تھا، سب خواب ہوا، کھووا پہاڑ اور نکلا کیا؟

”تم گل کو ساتھ لے جاؤ۔ وہ بھی بس آنے ہی والی ہے۔“ میں نے اس کو تسلی دینے والے انداز میں کہا تھا مگر وہ بول اچھلا گویا اسے کرٹ لگ گیا ہو۔

”توبہ کریں جی! پھوپھو کو تو اس لیے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ چند دن کے لیے ہی سہی، میری بچن سے جان چھوٹ جائے گا، میں بھی چار دن سکھ کا سانس

لے سکوں گا۔ مجھے پاگل کہتے نے کانا ہے کہ میں گل کو لے جاؤں گا کہ میری مزید سختی آجائے۔ میں دو گھڑی کے لیے بھی بچن سے باہر نہ نکل سکوں۔“ کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہا تھا۔ گل کی بدحرامی اور کام چوری مجھ سے بڑھ کر کون جان سکتا تھا۔ کابلی اور سستی خصوصاً بچن کے کاموں میں محترمہ گل پر ہی ختم ہوتی تھی۔

”بچن کے کاموں سے تو گل کی جان جاتی ہے۔“ میں نے شکوہ کوڑالی گھیس کر اندر آنے دیکھ کر گھورا۔ اس کے لیے اتنا اہتمام کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ بڑوس سے تو آیا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ شکوہ بھلا کیا قصور ہے۔ آرڈر تو میں نے خود ہی دیا تھا اور ادھر کیف نے مجھے ہکا بکا کر دیا۔ وہ کباب کھاتے ہوئے بول رہا تھا۔

”اسی لیے تو میرا اور فیملی پلٹوں کا مشترکہ فیصلہ ہے کہ گل ہماری بھابھی نہیں بن سکتی۔“ میں اس کے لیے چائے بناتے بناتے اچھل کر رہ گئی۔ اس نے بات ہی کچھ ایسی کی تھی۔ میرا جو ننان فطری تھا۔

”ہائے گل بھی ٹھکانے لگنے کے قریب قریب پہنچ گئی۔“ صدمے سے میرا لہو بھر خون خشک ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے بی اے کی موٹی موٹی کتابیں گھومنے لگی تھیں۔ اگر اس سال بھی کوئی امید کی کرن نظر نہ آتی تو مجھے قوی یقین تھا، ممانے اسلام آباد سے واپس آکر ایڈمیشن فارم میرے منہ پر ضرور دے مارنا تھا اور مجبوراً ”روتے دھوتے“ مجھے اس فارم کو بھرتا تو ضرور ہی تھا۔ ورنہ ممانے دھناتی کون کروا تا۔

”پھوپھو کی خواہش ہے۔ میرے بھائی سے گل کی بات بن جائے مگر میرے اور میری پلٹوں جیسے ظالم سماج کے ہوتے ہوئے بھلا یہ بات بن سکتی ہے۔“

”مگر گل میں بھلا کیا کی ہے؟“ میں نے مرے

مرے لہجے میں کہا۔

”نہیں، تم کوئی نہیں۔۔۔ ہمارے لیے تو بہت اچھی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ ہمیں گھر سنبھالنے کے لیے عورت کی ضرورت ہے نہ کہ کوئی ایسی آجائے جو

سارے نظام کو ہکا بکا کر رکھ دے۔ اب دیکھیں نا، گل سال کے چھ مہینے بیرون ملک کے دوروں پر رہتی ہے۔ ایسے میں ہمارے گھر کی بھلا کیا حالت ہوگی اور ویسے بھی گل اپنے کمینڈا والے چاچو کے بیٹے میں انٹرنسٹ ہے۔ پھوپھو خود بخود جذباتی ہو رہی ہیں۔ خیر یہ ان کا اور گل کا ذاتی معاملہ ہے۔ امید ہے گل پھوپھو کو قائل کر ہی لے گی۔“ کیف نے چوتھا کباب اٹھاتے ہوئے وضاحت کی تھی۔ میں اس کی بات سمجھ کر سر ہلانے لگی۔

”میں پھوپھو کو لینے کے لیے آیا تھا۔ ایک بھائی کے لیے ایک لڑکی دیکھی تھی مگر وہاں بات بنتے بنتے رہ گئی۔“ کیف کا منہ اتر گیا تھا۔

”مگر کیسے؟“ میں نے بے ساختگی سے پوچھ لیا۔

”محترمہ کو کچھ پکانا نہیں آتا۔“

”ہائے صرف اتنی سی بات؟“

”یہ اتنی سی بات نہیں۔“ کیف نے چکن رول اٹھایا اور پھر دوبارہ پلیٹ میں رکھ دیا۔ ”جو خاتون بچن کے نام سے گھبراتی ہوں۔ انہیں شوکیس میں سجانے کے لیے تو گھر نہیں لے کر جاتا۔“

”ہاں یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔“ میں نے فوراً اتفاق کر لیا تھا۔ کیف کو ویسے بھی بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ وہ بہت اچھی طرح سے مقابل کو قائل کر لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ صرف چند دنوں میں میری کیف کے ساتھ اچھی دوستی ہو گئی تھی اور اس کا بھی زیادہ تر وقت ہمارے گھر میں گزرتے لگا تھا۔ کیف نے بڑی ممانور میری ممانے بھی خاصی جان پہچان بنالی تھی۔ ایک تو وہ بلا کا باتونی تھا۔ ایسے ایسے لپٹنے اور چٹکے چھوڑا کہ ہنس ہنس کر اگلا بندہ بے حال ہو جاتا۔ البتہ کیف کی ہمارے گھر میں آمدورفت رخسانہ آئی کو پسند نہیں آئی تھی۔ اکثر جب کیف میاں ہوتا تو آئی اسے کسی نہ

کسی بہانے بلائے آجاتی تھیں۔

کیف چند ہفتوں کے قیام کی غرض سے یہاں آیا تھا۔ اس کے آفس کا کوئی کام تھا۔



اس دن میں مارکیٹ سے کچھ ضروری سامان لینے کے لیے گئی تو کیف سے بھی ملاقات ہو گئی تھی۔ دو دن بعد نظر آیا تھا۔ ان دنوں کام میں بہت مصروف تھا۔ اسی لیے پارک میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ ورنہ تو روزانہ ہی میں اسے قریبی پارک میں شملتے اور موبائل فون پر مصروف دیکھتی تھی۔ اس وقت بھی اسے فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرتے دیکھ کر مجھے بے ساختہ خوشی محسوس ہوئی۔

”کہاں تھے اتنے دن؟“ میں نے بڑے بڑے تھیلے اس کے ہاتھ میں زبردستی تھماتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ مصروف تھا۔ تم سناؤ؟ آج کل کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح شائستگی بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

”بس وہی پڑھائی کا رونا۔“ میں نے دکھی دل سے بتایا۔ ممانے آتی ہی میری ہنسی سی جان پر پھر سے کتابوں کا بوجھ لا دیا تھا۔ بقول ممانے جب تک شادی نہیں ہوتی، فارغ رہنے سے بہتر ہے، مصروف رہو اور اب تو میں سچے دل سے شادی کے لیے دعائیں کر رہی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس دفعہ بھی میں ہرگز ناس نہیں ہو سکوں گی اور فیل ہونے سے بہتر تھا، میں کسی کی بے رنگ زندگی میں رنگ بھر دوں۔ مگر مسئلہ تو صرف یہ تھا کہ خاندان کا کوئی بھی مرغا بچ نہیں پایا تھا اور خاندان سے باہر نکلنے جھانکنے کی ممانے مجھے اجازت نہیں دے رکھی تھی اور نہ ہی میرا ایسا کوئی ارادہ بھی تھا۔

”آئی کا ارادہ تم سے جب کروانے کا ہے؟“ کیف کا انداز کچھ سوچتا ہوا تھا۔

”نہیں تو۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”پھر کیا ضرورت ہے، خواہ مخواہ تمہیں تکلیف دینے کی۔“ وہ منہ بنا کر بولا۔ ”آئی کو چاہیے تمہاری شادی کر دیں۔“

”لوکی، کر لو گھل۔ یہاں کوئی پروڈل آتا تو بت بات بھی تھی۔ بندہ رو دھو کر گھر والوں کو شادی کے لیے منوا ہی لیتا۔“ میں نے کڑھ کر سوچا۔

”تم بھوک ہڑتال کرو۔“ کیف نے اسے نئی راہ دکھانا چاہی تھی۔

”ممان اوتھے ہتھکنڈوں سے متاثر نہیں ہو سکتیں۔“ میں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔

”اچھا! ایک اور طریقہ بھی ہے، تم بیمار پر جاؤ۔“

”مگر کیسے؟“

”بھئی، ہر روز جھوٹ موٹ کا دورہ بنالیتا۔“

”پھر ممالوگ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر بھاگیں گی، سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔

”تم ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا۔“

”میں نہیں جاؤں گی مگر ڈاکٹر خود چل کر میرے پاس آجائے گا۔“ میں بیزاری سے بولی۔ ”کچھ اور سوچو۔“

”کہہ دو، میری یادداشت چلی گئی ہے۔ ابھی میں گاڑی نکال کر لاتا ہوں۔ معمولی سی ٹکڑے بعد تم بے ہوش ہو جانا۔“ اس نے ایک اور نادر ترین حل پیش کیا، جسے سن کر میرا منہ بن گیا تھا۔

”ناکہ میرا دماغ علاج ہوتا شروع ہو جائے اور پھر ماما اور بابا کو پتا چل جائے کہ میں انہیں پریشان کرنے کے لیے ڈرائے کر رہی ہوں۔“

”ایک اور حل بھی ہے میرے پاس۔“ وہ پھر سے سوچ میں گم ہوا۔

”جلدی بتاؤ۔“ میں بے صبری سے بولی۔

”تم خود کشی کرو۔“

”ہائے خوشی۔“ میں گویا یک کر دور ہوئی۔

”یعنی مرجاؤں؟ محض بڑھائی سے بچنے کے لیے۔“

میری آنکھوں کو ڈیلے گویا باہر نکلتے گئے۔

”نہیں تو۔“ وہ گویا جھنجھلا گیا۔ ”مرنے کے لیے کون کہہ رہا ہے۔ صرف خود کشی کی کوشش کرنا۔“

”میرے سے چھلانگ مار دینا۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”ناکہ میری ساری ہڈیاں ٹوٹ جائیں۔ میں لنگری

ہو کر بستر سے لگ جاؤں۔“ ایسے خوفناک مشورے نے مجھے پیسہ پیسہ کر دیا تھا۔

”بدمعاش! وہاں سے چھلانگ مارنا تاکہ ہڈیاں ٹوٹنے سے بچ جائیں۔ بس اس کا وہاں رکھنا کہ اس منظر کو کوئی دیکھ لے۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ میں نے مشکوک انداز میں اسے گھورا۔ ”تم مجھے دنیا سے بھگانے کے طریقے کیوں بتا رہے ہو۔“

”ایک آخری آئیڈیا بھی ہے میرے زرخیز دماغ میں۔“ کیف نے چٹکی بجا کر کہا۔

”مجھے تو معاف کرو۔“ میں نے دونوں ہاتھ جوڑے۔ میں سڑک پار کرنے لگی تھی۔

”ارے سن تو لو۔“ وہ میرے پیچھے بھاگا چلا آیا۔

”کیا ہے؟“ میں ناراضی سے بغیر کے بولی۔

”تو تم شادی کرو۔“ اس نے پھر سے میرا دل جلا یا۔

”کس سے۔“ میں نے بغیر سوچے سمجھے دانت پس کر بھناتے ہوئے کہا تھا۔

”ایک سے۔“ وہ میرے سامنے کھڑا بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ یوں کہ میرا اطمینان پل بھر میں ہوا ہو گیا۔

”مگر۔“ میں نے کچھ بولنا چاہا تھا مگر کیف نے گویا ہاتھ اٹھا کر میری بات قطع کر دی۔

”کوئی اگر مگر نہیں۔ کیا میں اور میری ماما تمہارا ہاتھ مانگنے آجائیں؟“ اب وہ بڑے صاف اور دونوک انداز میں پوچھ رہا تھا اور میری حیرت کی گویا انتہا ہو چکی تھی۔

”مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ میں ہکا بکا رہ گئی۔ ”بھلا یوں کھڑے کھڑے رشتے طے پاتے ہیں؟“

”کیوں نہیں ہو سکتا۔“ وہ پرجوش سا بولنے لگا۔

”تم ہمارا آئیڈیل ہو ساجی! ہمیں جس لڑکی کی تلاش تھی۔ وہ لڑکی صرف تم ہو سکتی ہو۔ تم میں جو خوبیاں موجود ہیں۔ ہمیں ایسی ہی خوبیاں والی لڑکی کی تلاش تھی۔ میری تلاش یہاں آکر ختم ہو چکی ہے اور میں تمہیں اپنی بھانجی بنانا چاہتا ہوں۔“

ہائے، مجھے کھڑے کھڑے ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔ اپنی اتنی تعریفوں نے تو میرے حواس معطل کر دیے تھے۔ اگر کچھ سنسنیل کر کیف کے تاثرات جانچ لیتی تو ضرور ٹھنک جاتی۔ مگر کیا ہے کہ مجھے کسی کو جانچنا پر کھنایا سمجھتا تو کبھی نہیں آیا۔ میں بے وقوفی کی حد تک سادہ ہوں۔ ان دنوں مجھے اپنی بے وقوفی کی خبر نہیں ہو سکی تھی، مگر وقت بہت بڑا استاد ہے۔ جو باتیں ماں باپ اور کتابیں تک سمجھا نہیں سکتیں، ان باتوں کو وقت اچھی طرح سے ذہن نشین کر دیتا ہے۔ اور وقت کی شاگردی میں رہنا کوئی آسان کام نہیں۔



یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب رخسانہ آنٹی نے اچانک کینڈا شفٹ ہو جانے کا اعلان کر دیا تھا۔ شوہر اور بیٹی چونکہ روہیں میں تھے۔ سو وہ تہائیوں سے گھبرا کر کینڈا چلی گئی تھیں۔ ان کی انیکسی میں ابھی تک کیف ہارٹس پذیر تھا۔

آنٹی کے چلے جانے کا بڑی ماما اور میری ممانے خاصا صدمہ لیا تھا۔ عرصہ دراز سے وہ ہمارے پڑوس میں رہ رہی تھیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد یوں لگتا تھا گویا برابر والا کھر سٹالوں میں ڈوب گیا ہے۔ آنٹی چلی گئیں تو کیف بھی گدھے کے سر سے سینک کی طرح چند دنوں کے لیے غائب ہو گیا تھا اور میں جواتنے دنوں سے اس کی عادی ہو چکی تھی، ایک دم پوکھلا کر رہ گئی اور جس دن وہ واپس آیا تھا۔ میں گویا پھٹ بڑی۔

”بھتیجی تائے کہاں دفع ہو گئے تھے؟“

”سائس تو لینے دو بتاتا ہوں۔“ وہ گھاس پر پھسکر مار کے بیٹھ گیا تھا۔

”جلدی سے بکو۔“ میں غصے سے بولی۔ اسو بھائی اور غانی کے بعد کیف ہی تھا، جس سے میں اس قدر بے تکلفی سے پیش آتی تھی اور دوسرے ماما اور بابا، کیف کی شرافت، نجابت کو دیکھ کر مطمئن تھے۔ انہوں نے کبھی مجھے کیف سے ملنے اور گپ شپ سے

نہیں روکا تھا اور ویسے بھی، کم ہون سا ہر وقت ملنے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ زیادہ تر پارک میں ہی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ پارک میں بچوں کے ساتھ دلی ہال کھیلتا تھا اور میں ماما کے ہزار مرتبہ مجبور کرنے پر چار پانچ راؤنڈ لینے کے لیے نکل آتی تھی۔ جب تک میں راؤنڈ لیتی تھی۔ اتنی دیر تک وہ والی ہال کھیلتا رہتا تھا۔ جوں ہی میں تھک ہار کر بیٹھ جاتی۔ وہ بال پھینک کر بھاگ آتا تھا۔

”یو سائے نا، میری وہ۔ اس کا برتھ ڈے تھا۔“ وہ پیسہ صاف کرتا ہوا بولا۔ یو سائس کی ”وہ“ تھی یعنی دوست، مگنیترا یا پھر بیوی۔ اس نے بھی ”وہ“ کی وضاحت نہیں کی تھی۔ ”میں نے بھی کبھی وضاحت طلب نہیں کی تھی۔ دراصل مجھے کریدنے کی کبھی بھی عادت نہیں رہی تھی اور نہ ہی میرا کیف کے ساتھ ایسا کوئی ریلیشن تھا جو میں یو سائے کے بارے میں کنشس رہتی۔ وہ مجھے خاصا ہمدرد، مخلص اور سادہ مزاج لگتا تھا اور ان دنوں تو میری ماما کے کہنے پر وہ مجھے آکٹا کس اور انگش بڑی دل جمعی کے ساتھ بڑھا رہا تھا اور میں وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی تھی کہ کیف سے اچھا کوئی آج تک مجھے بڑھاپا یا تھا اور نہ ہی کچھ سمجھایا۔

مما کیف سے بہت خوش تھیں کیونکہ میرے مستہلی ٹیسٹ دیکھ کر ماما کا دل خوش ہو گیا تھا اور وہ اس کامیابی کا سارا کریڈٹ کیف کو دے رہی تھیں۔ میری محنت کو وہ کسی کھاتے میں نہیں سمجھتی تھیں۔

”تو بتا کر جاتے۔“ میں نے ناراضی جتائی۔

”کیوں بھی آپ نے مجھے مس کیا تھا؟“ وہ صاف مجھے چڑا رہا تھا۔

”ہو نہ ہو، کوئی نہیں۔“

”تم تو خوش ہوگی، پڑھائی سے جان چھوٹی رہی اتنے دن۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ میں جربز ہوئی۔

”تم آوارہ گردی کر آئے؟“

”لوکی! احترام سے بلایا کرو۔ میں تمہارا استاد ہوں۔“ وہ خواہ مخواہ استاد بنا۔

”تمہاری یوسا ٹھیک ہے؟“ میں نے جان کر اسے چھیڑا۔

”ایک دم ٹھیک ہے، فرسٹ کلاس۔“ وہ دور سے آکس کریم والے کو آدیکھ کر اٹھ گیا تھا۔

”اور تم؟“

”میں تمہارے سامنے ہوں۔“ وہ دو آکس کریم لے آیا تھا۔

”بڑے فریش لگ رہے ہو۔“ میں نے اپنا فیورٹ فلیور بن دیکھ کر منہ بتایا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”آکس کریم۔“

”مگر مجھے مینگو فلیور پسند نہیں۔“ میں نے ناک چڑھائی۔

”تو نہ کھاؤ۔۔۔ مجھے دے دو۔“ وہ اطمینان سے بولا تھا۔

”تم سے ایک بات کرنا تھی ساجی۔۔۔!“ کافی دیر سوچنے کے بعد وہ بہت شجیدگی سے بولا تھا۔ میں کچھ چونک گئی۔

”کیا؟“

”وہ دراصل میری اما آنا چاہتی ہیں۔“ بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

”تو آجائیں۔۔۔ اس میں سوچ بچار کرنے والی کیا بات ہے۔“ میں اس کی بات کا مقصود نہیں سمجھی تھی۔ دراصل مجھے بات تو کیا، لہجے سمجھنا اور چہرے پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔

”میرا مطلب ہے، ایک خاص مقصد کے لیے آئیں گی۔“ وہ سر ہٹائے گھاس کے تنکے نوچ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی خشک گھاس کے تنکوں کی ایک ڈھیری لگ چکی تھی۔

”کیسا مقصد؟“ اب میں کچھ کچھ سمجھ تو چکی تھی۔

”تاہم مزید وضاحت بھی ضروری تھی۔

”ایک کے لیے آئیں گی۔ میں نے تمہاری اتنی تعریفیں کی تھیں کہ وہ تم سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئی ہیں۔“

اس نے تعریف کا ایک جال میری طرف پھینک دیا

تھا اور میں اس جال میں الجھنے کے قریب قریب پہنچ چکی تھی۔ دراصل اپنی تعریف کے ناپسند ہوتی ہے اور میری جن خوبیوں کی میرے گھر والوں کے نزدیک کوئی وقعت یا اہمیت نہیں تھی۔ وہ انہی خوبیوں کو میری نظر میں اور بڑھا کر پیش کرتا تھا۔ دراصل یہ بھی ایک فن ہے۔ شائستگی اور سلیقے کے ساتھ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا فن۔ یہ ہنر بھی کسی کسی کو آتا ہے۔

”تم بہت اچھی کو لنگ کرتی ہو۔ تم میں سلیقہ ہے۔ گھر نبھال سکتی ہو۔ اما کہتی ہیں ایک لڑکی کو ہر فن میں طاق ہونا چاہیے اور وہ عورت ہی کیا، جو گھرداری کے قریب سے واقف نہ ہو۔“ وہ اپنے مخصوص دھیمے اور براثر لہجے میں کہہ رہا تھا اور اس کی باتوں سے اس کے لہجے کی تاثیر سے کوئی بھی عقل و فہم والا بندہ قائل ہو سکتا تھا جبکہ میں تو پھر ایک احمق اور بدھوشی لڑکی تھی۔

دراصل میرے لیے بے وقوف اور کم عقل جیسے الفاظ ہی مناسب تھے۔ اس وقت میں سفاکانہ حد تک خود کو احمق ترین مخلوق بھی کہہ سکتی ہوں، ہاں اس وقت مجھے یہ الفاظ بہت زہریلے اور اناذاق اڑانے والے محسوس ہوئے تھے جب ممانے مجھے بتایا کہ

”تم احمق اور پاگل ہو ساجی! ہمیں یہ سب تمہارے لیے بہتر نہیں لگ رہا۔“

”آپ تو چاہتی ہی نہیں، میں قدر دان لوگوں میں جاؤں جو میرے سلیقے سے متاثر رہیں۔ جو میری ڈگریوں کی بجائے میرے ہاتھ کے ڈانٹے کی تعریف کریں۔ پلیز ماما! میں ساری زندگی احساس کمتری کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔ مجھ سے یہ طبع بھی نہیں برداشت ہو سکے گا کہ میں کند ذہن تھی یا پھر میرا اکیڈمک ریکارڈ اچھا نہیں تھا۔“ میں احساس کمتری کا شکار تھی اور اسی خوف کے زیر اثر میں نے کیف کے بھائی کے حق میں ووٹ دے کر اپنے لیے ایک بھرے پرے کنبے کا انتخاب کر لیا تھا۔

میرا شہر ڈائیر کار زلٹ آیا اور میں خوش قسمتی سے پاس ہو گئی۔ ابھی میری اس خوشی کو مسلیب ریٹ کر رہے تھے کہ ایک نیا واقعہ رونما ہو گیا۔



پوری زندگی میں شاید پہلی مرتبہ میں نے خوشی کا ج کج جانے کی تیاری کی تھی اور اس سے پہلے کالج کے لیے ضروری چیزوں کی شاپنگ بھی کی تھی۔ ماما اور بڑی ماماں کا پلاٹ پر حیران تھیں۔ اور ڈیڈی پاپا بے انتہا خوش۔

مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ میرے اندر تبدیلیوں کی اصل وجہ کیف کی ذات تھی۔ وہ میرے لیے ایک مخلص دوست ثابت ہوا تھا اور اس نے مجھے احساس کمتری کے بھروسے نکال دیا تھا۔ اس نے میری ذات کی اہمیت کو اپنے جاندار لفظوں کا پیرا بن دے کر مجھے پہلے سے بھی زیادہ بااعتماد کر دیا تھا۔ یہ بات بھی مجھے بہت بعد میں پتا چلی تھی کہ دراصل کیف کا مقصد مجھے بااعتماد کرنا نہیں بلکہ میرا اعتماد جیتنے کی کوشش کرنا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی اس دن کی جب میں کالج جانے سے پہلے جھٹ پٹ ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ ماما اور بڑی ماماں اچال اپنے کمروں میں تھیں۔ ڈیڈی اور پاپا نماز کے بعد سو جاتے تھے۔ جب تک وہ فریش ہو کر میز تک آتے تھے۔ میں ان کی پسند کا ناشتہ تیار کر چکی ہوتی تھی۔ یہی میری روٹین تھی۔ اس وقت بھی میں نے شمو کے ساتھ مل کر رتن میز پر سجا دیے تھے جب کیف کی کال نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

میں موبائل اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ ساتھ ساتھ یونیفارم بھی پریس کر لوں گی کیونکہ میں جانتی تھی کیف لمبی بات کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

”استاد محترم! خیریت تو ہے۔ صبح صبح فون کھڑا کیا ہے؟“ میں نے موبائل کان سے لگا کر استری کا پلنگ لگاتے ہوئے کہا۔

”بس ایسے ہی۔“

”جھوٹ نہ بولو۔“ مجھے قطعاً یقین نہیں آیا۔

”سویرے سویرے میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔“

”اتنے بھی تم بچے نہیں ہو، دوست!“ میں نے طنز یہ کہا۔

”یہ تو تم نے بچ کہا۔ سو فیصد ٹھیک کہا۔“ اس نے فوراً اتفاق کر لیا تھا۔

”ہم ہمیشہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔“ میں خواجواہ اترائی۔

”ججائے کیوں وہ منس دیا۔“

”تم بہت سادہ ہو۔“

”شکر ہے، توازش۔“ میں اسے چڑانے کی غرض سے بولی تھی۔ شاید وہ میری سادگی پر چوٹ کر رہا تھا۔

”بہت نادان بھی ہو۔“

”ٹھیک فرمایا آپ نے۔“ میں مزے سے بولی۔

”اور تم بہت چالاک ہو۔“

”ہاں واقعی۔“ وہ پھر سے مسکرایا تھا اور اس کی ہنسی کی آواز سن کر میں نے بس ایسے ہی عام سے لہجے میں کہہ دیا تھا۔

”اور کبھی کبھی یہی چالاک آپ کے منہ پر بھی آپڑتی ہے۔ خود کو عقل کل نہیں سمجھنا چاہیے۔“

”بڑی عقل کی باتیں کرنے لگی ہو۔“ دوسری طرف حیران ہونے کی اداکاری کی گئی تھی۔

”آخر کس استاد کی شاگردی میں ہوں۔“ میں نے عاجزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ دوسری طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔

”فون کیوں کیا تھا؟“ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دوہرایا۔ کپڑے استری ہو چکے تھے۔ اب میں جوتے نکال رہی تھی۔

”آج اما تمہارے گھر آئیں گی۔“ بالآخر اس نے فون کرنے کی وجہ بتائی دی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے میں ختم سی گئی تھی اور میرے دل کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب ہو گئیں۔ مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں کیا تھا اور میری خاموشی سے وہ اپنے مطلب کے معنی افاد کرنے لگا۔

”تمہیں برا لگا؟“ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مجھے ہر گز برا نہیں لگا مگر پھر بھی اس نے پوچھا۔

”مجھے برا کیوں لگے گا۔“ آخر کار میرے استاد محترم

ایک تو موت میں کافی ہلکے ہلکے اور کم قیمت کے کپڑے لیے تھے۔ دوسرے چھ ویسے بھی بھاری لباس سے الجھن ہوتی تھی اور جب لینے کی باری آتی تو کیف نے مجھ سے پوچھا۔

”لنگا کیسا ہونا چاہیے؟“

”لنگا نہیں۔“

”تو پھر؟“

”میں کچھ اور لوں گی۔“ میں نے بھاری بھر کم لینے دیکھ کر ایک ہلکا سا نفیس کام والا شلوار قمیض پسند کر لیا تھا۔

”شانگ پنگ لے لو، ایک کو یہ کھر پسند ہے۔“ کیف نے مجھے سرخ رنگ کا انتخاب کرتے دیکھ کر فوراً کہا تھا۔ حالانکہ سرخ رنگ کو میں اپنا کسی کھر سمجھتی تھی۔ یہ رنگ میرا پسندیدہ تھا مگر اس کے باوجود میں نے ایک کی پسند کو اولیت دی تھی۔

شانگ کے دوران یو سا ہمارے ساتھ رہی تھی۔ یو سا، کیف کی کزن اور منگیت تھی اور جس طرح کیف اس پر دل کھول کر خرچ کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ کیف یو سا سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ کیف کی یو سا کے لیے محبت اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر ہو رہی تھی اور میں وہ وقت سے کہہ سکتی تھی کہ اتنی خریداری میں نے نہیں کی تھی، جس قدر یو سا نے کی تھی۔ مگر ترین کپڑے اور سونے کے زیورات، اس کے علاوہ بھی نجانے کیا کچھ۔

میرا سامان کیف نے میرے حوالے کر دیا تھا اور یو سا پوری گاڑی اپنی چیزوں سے بھر کر جہلم چلی گئی۔ حالانکہ جب میں برائیل ڈریس خرید رہی تھی تب کیف برابر مجھے حنا کر رہا تھا۔

”ہاتھ ہولا رکھنا فریڈ! تمہارے انہوں نے میری جیب میں کچھ خاص رقم بھر کر نہیں بھیجا۔“

”اپنے بھائی سے کہنا وہ شادی کر رہا ہے یا پھر برتھ ڈے میلایوٹ کر رہا ہے۔“ میں نے ہنسا کر کہا تھا۔

اگرچہ مجھے خود ان باتوں کا خاصا خیال تھا مگر کیف کا بار بار جارتنا مجھے بہت برا لگ رہا تھا۔

پھر ایک دن کیف نے اچانک فون کر کے مجھے حیران کر دیا۔ ”ایک سے بات کرو گی؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

”میں۔۔۔ مگر کیوں؟“ میں گھبرا اٹھی۔ شادی میں چند دن تو رہ گئے تھے اور آج سے پہلے اوہرے کوئی ایسا معاملہ سامنے نہیں آیا تھا اور پھر ماما سے پوچھنے بغیر میں بھلا کیسے بات کر سکتی تھی۔

”بس ایسے ہی تم نہیں کرنا چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔“ کیف نے مزید کچھ سننے سے پہلے فون رکھ بھی دیا تھا۔ آج تو مجھے تھا کہ کیف کو بھی میں سمجھ نہیں پاتی تھی۔ عجیب سا بندہ تھا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔

ان ہی الجھی سلجھی سوچوں سمیت شادی کا دن بھی آگیا تھا۔ اس دن عام لڑکیوں کی طرح مجھ پر بھی گھبراہٹ سوار تھی اور اُنسو بھی وقتاً فوقتاً بغیر کسی وجہ کے گرتے جا رہے تھے۔ ماما اور بڑی ماما میرے سامنے خود کو پیش رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر یہ کوشش کبھی کبھی ناکام ہو جاتی تھی۔ پورا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ گھر کے لان میں شامیانے لگے تھے۔ رات کو مہندی کی تقریب کا انتظام ہوٹل میں تھا۔ البتہ بڑی ماما کی خواہش تھی کہ رخصتی کسی ہوٹل سے نہیں بلکہ گھر سے ہونا چاہیے۔

نکاح سے کچھ دیر پہلے میں نے عجیب سی دہلی دہلی سرگوشیاں سنی تھیں اور کچھ دیر بعد کھل کر بات سامنے آگئی۔ کیف نے ماما سے بڑے واضح لفظوں میں کہا تھا۔

”آئی جی! آپ نکاح نامے میں حق مہر کے طور پر ایک سے کچھ بھی لکھوائیں۔ ساجی کے تحفظ کے طور پر۔“

”پرینٹ! اس کی کیا ضرورت ہے۔ جو کچھ شرعی طور پر ہو گا۔ ہمیں منظور ہے۔“ ماما نے سلیقے سے کہا تھا۔

اگرچہ بات تو درست تھی مگر میرے والدین اس چیز کو کافی غیر مناسب سمجھتے تھے۔

”نہیں آئی! ضرورت ہے۔ یہ ساجی کا حق ہے۔“ وہ اپنی بات پر زور دے کر لڑا تھا۔ ”میں ایک سے بات کرنا ہوں۔ وہ اپنا گھر چار فرخچاڑ میں سے دفتر نچاڑ اور کارخانہ ساجی کے نام لکھ دے۔ یہ ساجی کا حق مہر ہو گا۔“

”مگر یہ تو بہت زیادہ ہے۔“ ماما گھبرا کر بولیں۔ ”اتنا بھی زیادہ نہیں۔ میں نے کہا نا یہ ساجیہ کا حق ہے۔“

اس کا اندازہ تو کس قسم کا تھا۔ ماما چ سی ہو گئی تھیں۔ اگرچہ مجھے بھی یہ حق مہر بہت زیادہ لگ رہا تھا مگر میں بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھی ورنہ ضرور بول اٹھتی۔

”ایک کیا سمجھے گا۔ ہم کس قدر لالچی ہیں۔“ مجھے یہی سوچ جا رہے ڈال رہی تھی۔ میں ماما کو منع کرنا چاہتی تھی مگر کیا اور ڈیڈی کے ساتھ مولوی صاحب کو دیکھ کر خاموش ہو گئی تھی۔ اگرچہ سننے میں آیا تھا کہ ایک نے کیف کے اس مطالبے پر کافی ناگواری کا اظہار کیا تھا۔ وہ مان نہیں رہا تھا مگر نجانے کیسے کیف نے اسے متاثر ہی دم لیا۔ کیف کے خلوص اور ہمدردانہ فطرت کی میں کچھ اور قائل ہو گئی تھی۔

سفینہ بیگم یعنی کیف کی ماما اس وقت بھی کچھ نہیں بولی تھیں، جب حق مہر کے متعلق دہلی دہلی سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ تب بھی وہ خاموش اور سر جھکائے بیٹھی رہی تھیں۔ نہ ان سے کسی نے پوچھا تھا نہ مشورہ لیا اور نہ ہی بڑھ چڑھ کر انہوں نے بولنے کی کوشش کی تھی۔ ایک چپ تھی ان کی، جو گھر آنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹی تھی۔

بس انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر خاموش لبوں سے ایک وعادی تھی اور میرے لیے ان کی یہ دعا پوری زندگی کا حاصل تھی۔

”سدا سسھی اور آباد رہو۔“



ایک کے ساتھ نئی زندگی کی شروعات نے میرے سارے خدشات دور کر دیے تھے۔ مجھے خوف تھا کہ وہ ضرور حق مہر میں لکھوائی جانے والی لمبی چوڑی جائیداد کے طعنے دے گا جتنے گایا کبھی بکھار طنز کی مار مارے گا۔ تاہم ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ میرے لیے ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر ثابت ہوا تھا اور اس کی محبت پر پہلے روز ہی میرا دل ایمان لے آیا تھا۔ سب سے بڑی سترت بات یہ تھی کہ اس نے میرے تعلیمی ریکارڈز کا ریکارڈ ہرگز نہیں لگایا تھا بلکہ اس معاملے میں بھی اس نے کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا۔ عموماً وہ زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ بھی اس کی گپ شپ نہ ہونے کے برابر تھی مگر اس کے باوجود وہ اپنی ماں اور بھائیوں سے بے حد محبت کرتا تھا اور مجھ سے بھی اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔

”ساجیہ! مجھے امید ہے، تم میرے گھر میں ایک اچھا اضافہ ثابت ہو گی۔ پلین! میری ماں اور بھائیوں کی عزت کرنا۔ ان کا خیال رکھنا۔ اس گھر میں سب سے مظلوم ہستی میری دادی ہیں۔ میں تم پر کوئی بوجھ نہیں ڈال رہا، بس دن میں کبھی کبھار ان کی خبر گیری کر لیا کرنا اور دوسرے نمبر پر میری ماں ہیں۔ ان کی ذات بھی قابل توجہ ہے۔ تھوڑا سا وقت انہیں بھی دے دیا کرنا اور بس، میرا تم سے کوئی مطالبہ نہیں۔ میں ہمیشہ تم سے مخلص رہوں گا اور تم سے محبت کرتا رہوں گا۔ بس ایک وعدہ کرو، کبھی بھی اپنے دل کو کسی اور کے خیال سے آلودہ نہیں کرو گی۔ میں سب کچھ برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں مگر بے وفائی ہرگز نہیں۔ تمہیں کیف نے میرے لیے پسند کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم ہم سب کے حق میں بہتر ثابت ہو گی۔ ہم بھائیوں میں بہت پیار ہے۔ ہمارے اس پیار کو ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کرنا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اسے سرشار کر دیا تھا۔

میرے لیے ایک کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ جس طرح ایک نے مجھے اپنے دل میں جگہ دی تھی، اسی طرح وہ بھی میرے دل کے ہر گوشے میں سا گیا تھا۔ وہ ایسا ہی تو تھا۔ ہمیشہ چاہے جانے کے لائق بہت اچھا بہت نیک، ہر لحیزہ۔ ایسے ہی لوگ ہمیشہ دلوں پر حکومت کرنے کا فن رکھتے ہیں۔ رخسانہ آئی اسی لیے تو ایک کو اپنا داماد بنانا چاہتی تھیں۔ جب ادھر سے دل برداشتہ ہو گئیں تو پھر بیٹی اور شوہر کے پاس چلی گئیں۔ ایک اور کیف کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کسی اور نے حاصل نہیں کی تھی۔ عون اور فائز دونوں نے انٹر کے بعد شادی کر لی تھی اور دونوں ہی ایک کے کاروبار سے منسلک ہو گئے تھے۔ دونوں کو مناسب جاب ایک نے ہی مہیا کی تھی۔ تاکہ وہ اپنی فیملی کا بوجھ خود اٹھا سکیں۔ اشعر ہاشم میں مقیم تھا۔ کم کم ہی گھر آتا تھا۔ البتہ عون اور فائز کی بیویاں نیا اور می گھر میں ہی ہوتی تھیں اور گل سے بھی بڑھ کر ست اور کاہل تھیں۔ پورا گھر نیچہ لی کے کندھوں پر تھا۔ وہ سیاہ و سفید کی مالک تھیں۔ جو مرضی پکا دیتی تھیں اور جیسا مرضی پکاتیں یہ سب صبر اور شکر کر کے کھا لیتے تھے کہ گھر کی خواتین نے کبھی ضرورت کے وقت بھی کچن میں نہیں جھانکا تھا۔

کیف ٹھیک ہی کہتا تھا۔ ان کے گھر میں سلیقے، قرینے کی بہت کمی تھی۔ تاہم یہ بات سراسر غلط تھی کہ کچن کیف سنبھالتا ہے شاید اس وقت مذاقاً اس نے کہہ دیا ہو گا تاہم میں تو صرف مجھے ہی کوئی ہر ایک پر رعب حملے اور کاموں کا رونا روتے دیکھ رہی تھی۔ ایک بہت مصروف رہتا تھا۔ اس کا کام ہی ایسا تھا کہ وہ رات سے پہلے گھر نہیں آتا تھا۔ نجمہ نے بتایا کہ ایک کھانا باہر سے کھا لیتا ہے اور مجھے سالن کے نام پر ملغوبے دیکھ کر ان کی بات پر لیٹھن آ گیا تھا۔ ایسے ملغوبے سے باہر کا کھانا ہی بہتر تھا۔ مگر گھر کے مرو بے چارے بھلا کیا کرتے۔

اما کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا۔ وہ پورا دن عبادت میں مشغول رہتی تھیں۔ گویا انہوں نے

دنیا کو خیر یاد کہہ دیا تھا۔ ایک عرصے سے ان کی یہی روٹین تھی۔ تینوں وقت کا کھانا انہیں کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ اسی طرح ہڈیوں کا ڈھانچہ سی، آثار قدیمہ جیسی وادی بھی پلنگ پر جت لیٹے بس پھٹ کو گھورتی رہتی تھیں اور جب اس کام سے تھک ہار جاتیں تو پھر کمری نپند میں گم ہو جاتیں۔ نجمہ بی جیسے تیسے بد مزہ میٹھی انہیں پلا جاتی تھیں۔ نیا اور سی نے بھی ساس اور وادی ساس کے کمرے میں جھانکنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سارا دن اے سی لگائے اپنے اپنے کمروں میں بند ہی وی دیکھنے میں مصروف رہتی تھیں۔ دونوں کے پاس ایک ایک بچہ تھا اور ان کی اپنی بے شمار مصروفیات تھیں، سو وہ گھر پر بھلا کیوں توجہ دیتیں۔ سونے، کھانے اور آرام کرنے کے علاوہ ان کا تیسرا محبوب ترین مشغلہ پارلر کے چکر لگانا تھا۔ صحت اور حسن کو نکھارنے کے علاوہ کوئی اور کام ان کے پاس نہیں تھا۔ اس گھر کی خواتین کی روٹین دیکھ کر تو مجھے غش آنے لگے تھے۔

”نیا اور سی گھر کی طرف توجہ کیوں نہیں دیتیں۔“ میں پورا ہفتہ ماما کے گھر رہنے کے بعد واپس آئی تھی۔ یہاں آتے ہی اسی گندگی، غلاظت نے استقبال کیا تھا۔ رانی اگرچہ صفائی کر کے کئی گھر پھر بھی جگہ جگہ فروٹ کے چھلکے اور ٹائیوں کے ریز پر پڑے تھے۔ حتیٰ کہ صوفوں کے اوپر ہسٹکشن کا چور ابھی شان سے بکھرا ہوا تھا۔ اگر لائن میں بیٹھ کر بیٹھ بوجا گی تھی تو پھر جھوٹے برتن اور چھلکے سینے میں کتنا نام لگ جاتا تھا۔ رات کو ایک اپنے مخصوص ٹائم یعنی ساڑھے گیارہ بجے گھر آیا تو میں نے کافی ناگواری سے اپنے بھرے دل کو خالی کرنا چاہا تھا۔

”وہ اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتیں، ماس لیے۔“ وہ فریٹش ہو کر بیڈ پر ٹیمپورائز ہو گیا تھا۔ ایک کو اور مجھے بھی لی وی سے دلچسپی نہیں تھی۔ سو ہمارے کمرے کا لی وی خاموش رہتا تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔“ میں برامان گئی۔ ”جس گھر میں قیام ہو چاہے وہ کرائے کا ہی کیوں نہ ہو، اسے اپنا سمجھ کر اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنا چاہیے۔“

”یہ تو تمہاری سوچ ہے۔“ اس نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

”مگر انہیں بھی ایسا سوچنا چاہیے۔ رانی ایک دفعہ صفائی کر جاتی ہے۔ پورا دن ہمیں خود ہی گھر کو صاف رکھنا ہوتا ہے۔ اگر گندگی یا پھیلاوا انہیں میٹھیں گے تو اگلے دن تک بھلا کیا حالت ہوتی ہوگی۔ بچے اس گندگی میں کھیلنے لگتے ہیں۔ فرش سے گندی چیزیں اٹھا کر کھاتے ہیں۔ اسی لیے آئے دن ڈاکٹروں کے پاس بھاگی رہتی ہیں۔“ میں نے کلس کر کہا تھا۔ اپنا سجا سجا میکے والا کھیر دیکھ کر آئی تھی سو اسی لیے طبیعت خاصی اوب رہی تھی کیونکہ میرے پیچھے اس کمرے کی صفائی تک نہیں کروائی گئی تھی۔ فریچر پر گرد کی ایک تہہ چمک رہی تھی۔

”اب بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ عون اور فائز کو چاہیے ان چیزوں کی طرف دھیان دیں۔ بیویوں سے انہیں کچھ اور نہ سہی، کم از کم کچن کی طرف توجہ خود دے لیا کریں۔“

”میں نے بھر کا راشن دس دن میں اڑا جاتا ہے۔ ظاہر ہے جب گھر کی خواتین توجہ نہیں دیں گی تو ہر چیز کو ضائع کر دیا جائے گا مگر یہاں شروع سے ہی ایسے حالات ہیں۔ وادی اور ماما سیدھی سادی خواتین تھیں۔ پکانا، کھانا آتا نہیں تھا۔ شروع سے ہی نجمہ بی سنبھالتی ہیں۔ نیا اور سی نے یہی کچھ دیکھا ہے۔ سو انہیں جان مارنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ خیر چھوٹو، ان باتوں کو یہ بتاؤ گھر والے کیسے ہیں؟ سفر میں پر ایلیم تو نہیں ہوئی؟“

ایک نے بات بدل دی تھی۔ جس بات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تھا۔ اس پر بھلا بحث میں وقت کیوں ضائع کیا جانا۔ اب وہ میرا حال احوال پوچھ رہا تھا۔ وہ میرے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بہت دھیان سے سنتا تھا۔ اگرچہ چھوڑ کر تو مجھے ایک ہی آیا تھا تاہم واپس میں ڈرامیور کے ساتھ آئی تھی۔ ایک ہفتہ تک

رہنا تو نہیں تھا مگر چونکہ عمو بھائی فیملی سمیت کراچی سے آگئے تھے سو ان کے بچوں کے لیے میں وہاں رک گئی تھی۔ حالانکہ میرا ابھی مزید رہنے کا ارادہ تھا مگر ایک نے مجھے ایک دن بھی اوپر نہیں رہنے دیا تھا۔ ”مسئلہ تو کوئی نہیں تھا مگر میں نے آپ کو بہت مس کیا۔“ میں ہونٹوں میں مسکان دہائے مزے سے بولی۔ اگرچہ میں نے سچائی کو ظاہر کیا تھا مگر ایک میرے اس سچ کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”سراسر جھوٹ۔ اگر مس کرنا ہی تھا تو میرے ساتھ ہی واپس آ جاتیں۔“

”پورے دو ماہ بعد گئی ہوں جناب، صرف ایک ہفتہ کے لیے۔“

”اور میرے لیے یہ ہفتہ پورے دو ماہ کے برابر تھا۔ دن گزرتا تھا نہ رات۔“ وہ میری طرف دیکھ کر دلکشی سے مسکرایا۔

”سراسر جھوٹ، اگر ایسی بات تھی تو آ جاتے۔ تا۔“

میں لاڈ سے بولی۔

”بس جی، کیا کریں۔۔۔ مجبوری تھی۔“ ایک نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”کیسی مجبوری؟“ میں نے آنکھیں دکھائیں۔

”میری جان! کاروبار سلطنت کی مجبوریاں کیا کم ہیں۔ ذرا ادھر ادھر ہو جاؤں تو لاکھوں کا نقصان ہو جاتا ہے۔“ وہ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے بولا تھا۔

”کیوں بھلا فائز اور عون وغیرہ ہوتے تو ہیں۔“

”مگر وہ اتنی توجہ نہیں دیتے۔ لاکھوں کا نقصان ان کی نظر میں کچھ نہیں ہوتا۔ اگر میری غیر موجودگی میں کچھ اونچ نیچ ہو جائے تو وہ لوگ سنبھال نہیں سکتے۔ ابھی نا سمجھ ہیں۔ آہستہ آہستہ سب سمجھ جائیں گے۔“

وہ حد درجہ سنجیدہ تھا اور خاموش ہی رہتا تھا۔ کم بولتا تھا مگر بہت اچھا بولتا۔ زیادہ تر میں ہی اسے بولنے پر اکساتی تھی۔ خود سے کبھی بھی گفتگو کا آغاز نہیں کرتا تھا۔ ہاں، محبت لٹانے کے معاملے میں وہ کبجوس ہرگز نہیں تھا اور اظہار کے معاملے میں تو بالکل نہیں۔ اپنے مخصوص لمبے میں دھیمادھیمابولتا وہ سیدھا دل

میں اتر جاتا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ وہ میرے بازو پر ہاتھ رکھے بڑی نرم گرم جذبے لٹانی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کے علاوہ کچھ اور سوچ سکتی ہوں۔“ میں اس کی محبت لٹانی نظر سے نظر اٹائی تھی۔

”ہمیشہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ اس کا گہیرا لہجہ یوں ہی دل دھڑکا دیتا تھا۔

”بھلا کیسے؟“ میں نے بوجھل پلکوں کو بمشکل اٹھا کر پوچھا۔

”تمہاری سوچوں میں، خیالوں میں، باتوں میں صرف میں ہوں، میرے علاوہ کوئی اور نہیں۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا تھا۔

”میرا دل پکا ایمان دار ہے۔ بے ایمانی نہیں کرتا۔“

”اور میں اسے بے ایمانی کرنے بھی نہیں دوں گا۔“ وہ میرے کان کے قریب لگتا تھا۔ ایک کی قربت کا شمار اس کی آنکھوں سے ہوتا ہوا میرے دل میں اتر آیا تھا اور میں اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کی آواز اپنے کانوں سے سن رہی تھی۔

دن کچھ اور آگے سر کے ٹوگھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے یکن ہی نہیں بلکہ پورے گھر کا انتظام سنبھال لیا تھا اور میرے اس عمل سے کسی اور کو تو

نہیں البتہ نجمہ بی کو خاصا دچکا پہنچا تھا۔ انہوں نے دے دیے لفظوں میں مجھے سمجھانا بھی چاہا تھا۔ ان کی ہر

ممکن کوشش تھی کہ میں امور خانہ داری سے دور ہی رہوں مگر میں نے ان کی کسی کوشش کو کامیاب نہیں

ہونے دیا تھا۔

میرے یکن سنبھالنے ہی ہر چیز میں ترتیب اور نفاست نظر آنے لگی تھی اور خوش رنگ کھانے دیکھ کر

تو کیف کے علاوہ عون اور فائز بھی تعریف کیے بنا نہیں رہ سکے تھے۔

اس گھر کے افراد کا ایک مسئلہ تو یہ تھا کہ سب لوگ

ایک جگہ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ رات کو مرد حضرات گھر میں ہوتے تھے مگر پھر بھی کھانا اپنے اپنے

کمروں میں ہی کھایا جاتا تھا۔ اس کے باوجود تقریباً سب ہی ہر روز نئی ڈشز کو دیکھ کر نہ صرف چونکے

تھے بلکہ ”فرا“ ”فرا“ سب ہی نے میرے ہاتھ کے زانے کو سراہا بھی تھا۔ ان میں نیا اور کسی بھی شامل

تھیں۔

”سچی بھائی! آپ تو بڑا اچھا کھانا بنا لیتی ہیں۔ کیا باقاعدہ کورس کیا ہے۔“ یہی تو کچھ زیادہ ہی ستار نظر آ رہی تھی۔

”نہیں“ میں نے اپنی بڑی ممتا سے سیکھا ہے۔ میں بھلا جھوٹ کیوں بولتی۔

”آپ میں بہت سلیقہ ہے بھائی!“ اب کے نیا نے کہا۔ ایک بات تو اچھی تھی کہ یہ دونوں میری تعریف سے نہ جلتی تھیں اور نہ ہی سراہنے میں مجھ

سے کام لیتی تھیں۔ اور پھر میں کون سا کسی سے تعریف سریشکیت حاصل کرنے کے لیے کام کرتی تھی۔ یہ

میرا گھر تھا اور ایک کے حوالے سے اس گھر کا ہر کام میرے لیے اہم تھا اور ہر فرد اہم ترین۔

یکن کی حالت بہتر کرنے کے بعد میں نے وادی کا کمر دیکھا تھا۔ وہ اس گھر کی بزرگ، ہستی تھیں، مگر ان کی اہمیت اور حالت کسی ٹوٹے پھوٹے ناکارہ سامان

سے بڑھ کر نہیں تھی۔

سب سے پہلے میں نے ان کے لیے آئرن راڈ کا سنگل بیڈ منگوا دیا جس کا گدرا انتہائی نرم اور آرام دہ

تھا۔ اس پر انے قدیم پلنگ کو اٹھا کر اسٹور روم میں رکھوا دیا تھا۔ وادی کے کمرے کے صدیوں پرانے

بردے میں کچیل اور دھول مٹی کے باعث اپنی اصل رنگت کھو چکے تھے۔ انہیں اتروا کر کوڑے دان میں

پھینکوا دیا اور نئے پردے دیے تھے۔ چھتیں، دروازے اور کھڑکیاں جھاڑیں۔ فرش کو سرف ڈال کر گرگڑا

کے رانی سے دھلوا دیا۔ کمرے میں اتنے سالوں سے رچی بو کا دھیرے دھیرے ہی سہی خاتمہ ضرور ہو گیا تھا۔

وادی کے سارے کپڑے استری کروا کر الماری میں ترتیب سے رکھے تھے۔ ایک سفید رنگ کا سوٹ انہیں منسا، دھلا کر پہنا دیا۔

اور جب دوبارہ انہیں کمرے میں لایا گیا تو ان کی بوڑھی آنکھیں روشن روشن منظر دیکھ کر نمی کے باعث چمکنے لگیں۔ وہ بول نہیں سکتی تھیں مگر اشاروں

سے انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ بہت خوش محسوس کر رہی ہیں۔ انہوں نے اشارے سے مجھے اپنے قریب

بلوایا اور میرے ہاتھوں اور سر کو چومنا تھا۔ اس محبت کے اظہار پر میری آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ میں نے

وادی کے سفید جھاگ جیسے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

”وادی! اس میز پر کھلے رکھے ہیں۔ آؤ بھی موجود ہیں۔ یہ پھل نرم ہے۔ آپ آسانی سے کھا لیں گی۔

بوا مل پانی بھی پیاس ہی رکھا ہے۔ آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہوئی تو یہ کھنی بجائیے گا۔ رانی فوراً آجائے

گی۔ میں ابھی آپ کے لیے مزید اس ساسوپ بنا کر لاتی ہوں۔“

”ہاں، ہاں۔“ وادی گویا میری بات سمجھ چکی تھیں، سو اسی لیے اثبات میں سر ملانے لگیں۔ میں

نے ایک سے کہہ کر ایک نرس کا بندوبست بھی کروا لیا تھا۔ یہ نرس بہت اچھی تھی۔ بیوہ عورت تھی۔

وادی کی جی جان سے دیکھ بھال کرنے لگی۔ انہیں منسلانی، دھلائی۔ روزانہ نیا سوٹ پہنانی احتیاط سے

کھانا کھلاتی تھی۔ وقت پر دوا دیتی۔

وادی کو خوش باش اور بہتر حالت میں دیکھ کر مجھے

لگتا تھا گویا میرے ذہن سے بوجھ ہٹ گیا ہے۔ اسی طرح ماما کا کمر ابھی ابھی کا شکار تھا مگر پھر میرے ہاتھوں

نے اس کمرے کو بھی سنوار کر ہی چھوڑا تھا۔ ماما نے بھی مجھے اپنی من مانی کرنے دی تھی۔ وادی کی طرح

انہوں نے بھی خاموشی سے مجھے سراہا ضرور تھا اور میرے سر پر پہلے دن کی طرح ہاتھ رکھ کر خاموش سی دعا دی اور پھر صبح کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

گھر کا اندرونی نظام میرے ہاتھ میں کیا آیا، نہ صرف

گھر میں سلیقہ نظر آنے لگا بلکہ یکن کے اخراجات بھی نہ ہونے کے برابر ہو گئے تھے۔ راشن ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اور جو پیسے بھی مختلف بلز اور راشن کے لیے ایک دیتا تھا۔ ان میں سے بھی کافی بچ جاتے تھے۔

حالانکہ پہلے پہل مہینے میں دو دو دفعہ راشن آتا تھا۔ جوں ہی میں نے یہ بات نجمہ بی سے کی تو وہ ٹھنڈے

لہجے میں بولیں۔

”بڑا! میں بھلا کیا کروں۔ کیف باؤ، راشن اور بل وغیرہ کے پیسے مجھ سے لے جاتے تھے۔ مگر نہ بل ادا

ہوتا تھا اور نہ ہی راشن آتا۔ مجبوراً میں پھر ایک سے پیسے مانگنے کھڑی ہو جاتی تھی۔“ نجمہ بی جی تو کہہ رہی

تھیں۔ انہیں بھلا اس بڑھاپے میں بھجوت بولنے کی کیا ضرورت تھی۔

”اگر کیف کو پیسے چاہیے ہوں تو ایک سے مانگے۔ گھر کے اخراجات میں سے پیسے کیوں لیتا ہے۔“ میں

البتہ کر رہ گئی۔

”ان ہی کے پیسے ہیں جی، جہاں سے مرضی لیں۔ ہم تو اس معاملے میں بول نہیں سکتے۔“ وہ ہاتھ جھاڑ کر

کھڑی ہو گئی تھیں۔

”بڑا! میں ذرا آرام کر لوں۔ اللہ تمہیں سکھ دے، جب سے آئی ہو۔ میری بوڑھی بڈیوں کی بچت ہو گئی ہے۔“ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں، تمام زندگی

ان کا اسی گھر میں قیام رہا تھا۔ آگے پیچھے کوئی تھامیں، سو ایک کے ابا قیوم انہیں اپنے گھر لے آئے تھے۔ یہ

ان کی خاندانی ملازمہ تھیں۔

میں اٹھ کر یکن میں آگئی۔ رات کے کھانے کی تیاری کرنا تھی مگر ماما کی فون کل نے اپنی طرف متوجہ

کر لیا تھا۔ فون بند کر کے ابھی یکن میں قدم رکھا ہی تھا، جب کیف آمدھی طوفان کی طرح چلا آیا۔

”نجمہ بی کہاں ہیں؟“ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا تھا۔

”وہ آرام کر رہی ہیں۔“ میں یکن کا پیکٹ کھول کر

گوشت کا حساب لگا رہی تھی کہ ایک پیکٹ سے رات کے لیے سالن بن سکے گا۔

”اور تم کیا کرنے لگی ہو؟“

”کھانے کی تیاری۔ میں نے ایک اور بیکٹ فریزر میں سے نکالے ہوئے بنایا۔“

”یہ کام مجھ ہی کے سپرد رہنے دینا تھا۔“

”کیوں؟ میں نہیں کر سکتی کیا؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”بہت اچھا کرتی ہو۔ مگر خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم نے اور ایک نے ہنی مون کے لیے نہیں جانا۔“ وہ کچھ کہتے کہتے بات پلٹ گیا تھا۔

”نہیں بھلا ہنی مون کے لیے جانا ضروری ہے؟“

”بہت ضروری ہے۔ تم لوگوں کو کہیں کھوٹے پھرے ضرور جانا چاہیے۔“ وہ اسٹول کھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔ یعنی اس کا ابھی مزید گفتگو کرنے کا ارادہ تھا۔

”تمہیں ایک سے بات کرنا چاہیے تھی۔“ وہ مجھے آکسا رہا تھا۔

”دیکھو گی۔ ایک فارغ ہوں گے تب ہی تو کہیں جاؤں گے نا۔“ میں نے نوکری میں سے پیاز نکال کر چیلنا شروع کر دی تھی۔

”اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرو گی تو پھر یوں ہی بیٹھی رہ جاؤ گی۔ وہ نہیں فارغ ہونے والا۔ یہ کاروبار یہ روپیہ پیسہ اسے جان سے زیادہ پیارا ہے۔ اب یہ ہونے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب یہ تمہاری محبت پر منحصر ہے کہ تم اپنی بات اس سے منوا سکتی ہو یا نہیں۔“ وہ بڑے عجیب سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”اگر تو تمہاری محبت کا پلڑا بھاری ہوا، پھر تو سمجھو تم کامیاب ہو گئیں۔“

”مجھے ایک کی محبت پر شک نہیں ہے۔ اگر وہ فارغ ہوئے تو ضرور میری بات مان لیں گے مگر مجھے ان کی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ سو اس لیے میں اپنی وجہ سے ایک کو پریشان نہیں کر سکتی۔“ میرا انداز وہ ٹوک قسم کا خاصا اور روکھا تھا۔ تب ہی تو کیف کالجہ بھی بدل گیا اور گفتگو کا انداز بھی۔

”اتنی مشرقیت کا اظہار کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ ویسے ہی تمہارے دام میں پھنس چکا ہے۔“

”کیف؟“ میں اس کے الفاظ سن کر دنگ رہ گئی تھی۔

”تم کس قسم کی لہنگو تاج پوش کر رہے ہو؟“

”میں نے کچھ غلط کیا؟“ وہ فوراً ”محبوب بن گیا تھا۔“

”میرے بھائی کو محبت کے دام میں الجھا تو لیا ہے۔ ویسے میں چاہتا بھی کی تھا۔“

”کیف! اذرا سوچ سمجھ کر بات کرو۔ میں اس وقت تمہاری بڑی بھابی ہوں۔ میرا اور تمہارا رشتہ بدل چکا ہے۔“ میں نے بشکل اپنا غصہ ضبط کیا تھا۔

”ہماری دوستی کا رشتہ تو ابھی تک قائم و دائم ہے۔ دوست ہونے کے ناتے تم میرا ساتھ دو نا۔“ وہ اتنے کھردرے لہجے میں بولا تھا کہ میرا دل کانپ کر رہ گیا۔

”کون سی دوستی؟“

”وہ ہی جو میرے تمہارے درمیان تھی۔“ وہ چپا چپا کر بولا۔

”تم آخر چاہتے کیا ہو؟“ میں اس کے بدلے انداز دیکھ کر ٹھٹھک گئی تھی۔ وہ مذاق کے رنگ میں بات نہیں کر رہا تھا۔ اس کا لہجہ گہرا طنزیہ، کٹ دار قسم کا تھا۔

میری ریزہ کی ہڈی سننا اٹھی۔

”اب کیا ہے نا، دانش مندانہ سوال۔ میں بھلا کیا چاہتا ہوں۔“ وہ دھیرے سے مسکرایا تھا اور پھر بولنے لگا۔ اور میرا رنگ لمحہ بہ لمحہ فقی ہو جا رہا تھا۔



نیا اور سہمی بھی ان دنوں اپنے حجرے سے باہر نکل آئی تھیں اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دونوں نے گہریلو امور میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ اگر میں کپڑے دھونے کے لیے مشین لگاتی تو سہمی یا نیا فوراً

ساتھ دینے کے لیے آجاتی تھیں۔ اسی طرح اگر میں سالن پکارتی ہوتی تو نیا بہترین دھونے کھڑی ہو جاتی۔ آٹا گوندھ دیتی۔ حتیٰ کہ روٹی بھی پکا دیتی۔ مجھ ہی کی گویا چھٹی ہو گئی تھی۔ اب وہ صرف سودا سلف لا کر دیتی تھیں۔

دوسری طرف سہمی کپڑے استری کرتی۔ مردوں کے الگ رکھتی۔ خواتین کے الگ رکھے جاتے۔ ان

دونوں کی شخصیت میں در آنے والی تبدیلیوں نے فائر اور عون کو بھی چونکا دیا تھا اور وہ ان دونوں کے سدھر جانے کا تمام تر کڑٹ مجھے دیتے تھے۔

ادھر کیف کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ سب گھر والے اس طرح سے میرے گرویدہ ہو جائیں گے۔ لما اور دادی کچھ کہتی تو نہیں تھیں مگر ان کی آنکھوں میں موجود شکر گزاری کے رنگ میری نظروں سے اوجھل نہیں تھے۔

نیا اور سہمی فیشن سے لے کر اسکن کی کیئر تک ہر مشورہ مجھ سے لینے کے لیے بھاگی بھاگی آتی تھیں۔ ان کے خیال میں میرے پاس معلومات کا بہت بڑا خزانہ موجود ہے اور میں بڑے شہر سے آئی تھی سو مجھے ہر فیشن کے بارے میں علم تھا۔ یہ تو نیا اور سہمی کی ساواگی بھی حالانکہ مجھے بدلے فیشن کا کچھ پتا نہیں تھا مگر میں غالی سے مفید مشورے لے کر انہیں معلومات فراہم کرتی رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ دونوں میرے اور بھی قریب آ گئی تھیں۔

ان کا زیادہ وقت اب میرے ساتھ گزرتا تھا۔ مل جل کر محبت کا کام بھی ہو جاتے تھے۔ گھر بھی صاف ستھرا ہو جاتا تھا اور پھر کافی دیر گپ شپ بھی چلتی رہتی۔ وہ دونوں صرف سونے کے لیے اپنے کمرے میں جاتی تھیں۔ زیادہ تر لاؤنچ میں ہی بیٹھی رہتیں۔

اس دن بھی سہمی اپنی بچی کا مجھ سے پوچھ کر ذراک سی رہی تھی اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھی۔ ایک دم میں نے بیگزین ہاتھ سے رکھ کر کچھ سوچنے ہوئے سہمی سے پوچھا۔

”بہت دن ہوئے کیف گھر نہیں آیا۔“

”وہ گھر کہاں آتا ہے۔ زیادہ تر شہر سے باہر ہی رہتا ہے۔“ وہ احتیاط سے سوئی دھاگہ ڈالتے ہوئے بولی۔

”مگر کیوں؟“ میں حیران ہوئی۔ جب سے میں آئی تھی۔ کیف کا یہی معمول دیکھ رہی تھی۔ تاہم میں نے ایک سے بھی نہیں پوچھا تھا کہ کیف کہاں جاتا ہے۔

”پتا نہیں۔“ صاف لگ رہا تھا وہ ٹالنے کی کوشش میں ہے۔

”کیوں پتا نہیں؟ یہ کمو، مجھے بتانا نہیں چاہتیں۔“ میں نے جذباتی بلیک میلنگ کا سہارا لیا تھا اور میری ناراضی کے خیال سے وہ فوراً ”بول اٹھی۔“

”نہیں بھابی! ایسی بات نہیں۔“ وہ کچھ گھبرا گئی تھی۔ ”دراصل پہلے ایک بھائی اور کیف کی سہمی بنی نہیں تھی۔ کیف ہر وقت ایک بھائی سے جھگڑتا رہتا تھا اور یہ جھگڑا شدت اختیار کر جاتا تھا۔ بات بات بھائی تک پہنچ جاتی تھی۔ ایک دفعہ کیف نے غصے میں ایک بھائی کا سر پھاڑ دیا تھا۔ ایک دفعہ گولی بھی چلا دی تھی۔ مگر یہ کافی سال پرانی بات ہے۔ اب تو اس نے ایک بھائی سے صلہ کر لی ہے۔ پہلے سے کافی بدل گیا ہے“

ورنہ تو ہر وقت خون سوار رہتا تھا اس کے سر پر۔ پھر جب اس نے بتایا کہ وہ ایک بھائی کے لیے لڑکی پسند کر چکا ہے۔ تو ہم سب حیران رہ گئے اور زیادہ حیرانی اس وقت ہوئی تھی جب ایک بھائی نے اس کی پسند کی لڑکی سے شادی بھی کر لی۔

ان دنوں ہم لوگ ایک بھائی کے لیے لڑکیاں دیکھ رہے تھے۔ عون کا خیال تھا۔ ایک بھائی کے ساتھ گل مناسب رہے گی مگر کیف کو گل پسند نہیں تھی اور یہ ہماری اور ایک بھائی کی خوش نصیبی تھی کہ آپ ہمیں مل گئیں۔ ”دراصل پہلے پہل ہمارے ذہن میں تھا کہ آپ بہت مغرور اور تنگ چڑھی ہوں گی۔ اسی لیے میں اور نیا آپ سے ذرا دور دور رہی تھیں مگر آپ تو ہماری سوچوں کے بالکل برعکس نکلی ہیں۔“

وہ ساواگی بھرے لہجے میں بتاتی چلی گئی تھی۔

”کیف کا جھگڑا ایک کے ساتھ کس بات پر تھا؟“

میں نے سوچوں کے کھنور سے نکل کر پوچھا۔

”یہ تو مجھے نہیں پتا۔ میرے آنے سے پہلے کی بات ہے۔“

”نیا کو بتا دو گا؟“ میں نے سہمی سے پوچھا۔

”نہیں، میرے خیال میں مجھ ہی جانتی ہیں۔“

خواتین ڈائجسٹ 253 دسمبر 2011

”اب تو ان کے درمیان کوئی لڑائی نہیں؟“ میں اپنی تسلی کے لیے پوچھ رہی تھی۔
 ”نہیں، بالکل بھی نہیں۔ ایک بھائی تو مزاجاً بھی اور دل کے بھی بہت اچھے ہیں۔ کیف جذباتی اور غصہ ور ہے۔ تاہم ایک بھائی نے بھی بات نہیں بڑھنے دی۔“

وہ فراک سی چکی تھی۔ اب سلمان سمیٹ رہی تھی اور میں گہری سوچوں میں ڈوب ابھر رہی تھی۔ دراصل میرا ذہن بری طرح سے الجھ چکا تھا۔
 ”آخر کیف نے مجھے کس مقصد کے لیے استعمال کیا ہے؟ مجھے ایک کے لیے پسند کرنا۔ جن مہر میں اتنی بھاری جائیداد لکھوائی۔“ میرا ذہن ایک نقطے پر آکر ٹھہر چکا تھا۔ ”بہر حال جو بھی ہے۔ کیف تو اپنے گھر والوں سے لے کر ایک تک سب کو دھوکا دے سکتا تھا مگر مجھے نہیں۔ میں یعنی ساجیہ مراد اس کے جال میں کبھی نہیں پھنس سکتی اور میرا یہ خود سے عہد تھا کہ اس ساری پلاننگ کی وجہ آخر جان کر ہی رہوں گی۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا تھا اور پھر مطمئن ہو گئی۔

یہ اس دن کی بات ہے جب ایک کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا تھا اور ٹھیک اسی شب کیف چلا آیا۔ اس کے انداز آج کافی بدلے بدلے لگ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا وہ کوئی فیصلہ کر کے آیا ہے۔ میں اس وقت چکن میں تھی اور وہ میرے پیچھے چکن میں ہی چلا آیا۔
 ”مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔“ اس کا انداز پھاڑ کھانے والا تھا۔ میری چھٹی حس نے فوراً مجھے چونکا دیا۔

”کون سی بات؟“

”میرے ساتھ آؤ۔“ اس کے دھونس بھرے انداز نے مجھے بے حد غصہ دلایا تھا مگر میں پھر بھی ضبط کر گئی۔
 ”کہاں؟“

”بیٹھک میں۔۔۔ مجھے تم سے تنہائی میں بات کرنا ہے۔“

”جو کہنا ہے۔ یہیں کہہ دو۔“ میں پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا تھا۔ پھر بڑے پرسرار انداز میں بولا۔
 ”میرے ساتھ ایک ڈبل کرو۔“
 ”کیسی ڈبل؟“ اب تم کے میں جیج ٹھنک گئی تھی۔ بات معمولی نوعیت کی نہیں تھی۔ میرا دل خوف کے مارے سکنے لگا۔

”یہ گھر تمہارے نام ہو چکا ہے اور ایک کی دو فرنیچر بھی۔۔۔ تم ان کے کاغذات قانونی طور پر میرے نام کر دو۔“ اس نے گویا بڑے اطمینان سے آگ پر پڑوں کے چھینٹے پھینکے تھے۔
 ”کیا مطلب؟“ میں جیج اٹھی۔

”چلاؤ مت، میری بات آرام سے سنو۔ میں نے یہ تمام کوششیں اسی وجہ سے کی تھیں۔ مجھے ایک کا اور تمہارا اعتماد جیتنا تھا اور پھر اپنا مقصد پورا کرنا تھا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ یو ساکے ذریعے اپنے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤں مگر پھر اپنی زندگی کی پہلی اور بڑی خوشی کو کھودینے کے خوف نے مجھے تم تک پہنچا دیا۔ میں یو ساکو ایک کے نکاح میں دے کر کوئی رسک نہیں

لے سکتا تھا۔ حالانکہ یو ساکے ذریعے ایک کی ساری برابری مجھے مل سکتی تھی۔ اب تو صرف اس گھر کی اور دو فرنیچر کی بات ہے۔ بہر حال تم مجھے تمام کاغذات دے دو۔ علاوہ اس مناج کی ذمہ داری تم ہی پر ہوگی۔ میں تمہارے ارد گرد ایک جال بن دوں گا۔ تم اس جال سے نکل نہیں پاؤ گی۔“
 وہ گویا زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا اور میرے قدموں کے نیچے سے زین دھیرے دھیرے سرکنے لگی تھی۔

”تم دھوکے باز ہو کیف! تم نے مجھے ہی نہیں اپنے بھائی کو بھی دھوکا دیا ہے جس کے ساتھ تمہارا خون کا تعلق ہے۔ مجھے افسوس ہے تمہاری گندی ذہنیت پر۔“ لاچ پر کمینگی دکھانے پر۔۔۔ میں گویا غصے کے عالم میں پھٹ پڑی۔

”کچھ بھی کہہ لو۔ کاغذات تو تمہیں دینے ہی پڑیں گے۔“ اس نے گویا آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔
 ”اور اگر نہ دوں تو؟“

”تو پھر اپنی جانی کے لیے تیار ہو جانا۔ میں ایک کو صاف لفظوں میں بتا دوں گا کہ تم میری محبت میں گرفتار تھیں اور میرے مجبور کرنے پر تم ایک سے نکاح کرنے پر تیار ہوئی تھیں تاکہ ایک کی دولت ہم دونوں ہتھالیں۔ تمہارے پاس موجود کاغذات تمہاری لاچ کے گواہ ہیں۔ ایک کو مزید یقین دلانے کے لیے میں تمہاری اور اپنی دوستی کا قصہ بھی سنا دوں گا۔ ایک دو گواہ بھی پیش ہو جائیں گے۔ پھر تم کیا کر سکو گی؟“
 وہ گویا استہزائیہ مسکرا رہا تھا۔ میری بے وقوفی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس نے مجھے ہی نہیں، ایک کے ساتھ بھی دھوکا کیا تھا اور نجانے اس نے مزید کیا کچھ کرنا تھا۔ میرا دل خوف کے مارے پھر پھر اُٹھتا تھا مگر میں نے خود کو کمزور ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”میں تمہیں کبھی بھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔ دھوکے باز اور فریبی لوگوں کو ان کے انجام تک پہنچا کر رہوں گی۔ تم نے رشتوں کے تقدس کا بھی خیال نہیں رکھا۔ کیا اتنے

سال کلج لگاؤ اور یونیورسٹی میں یہی سیکھتے رہے ہو؟“
 ”زیادہ بڑبڑا کرنے کی ضرورت نہیں۔ خوب سوچ سمجھ لو۔ ورنہ اپنی بربادی کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ کیف نے گویا آخری وار تنگ دی تھی۔

”تم ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو۔ اگر جائیداد کا کوئی جھگڑا ہے تو ایک سے کہو۔ اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے۔“ میں گویا ٹھنک کر بولی تھی۔

”اگر وہ آرام سے مانی جاتا تو پھر مجھے اتنی بڑی پلاننگ کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ ہمارے حق پر قبضہ جما رکھا ہے۔ اور ہمیں اپنے کاروبار میں تنخواہ دار ملازم رکھنا چاہتا ہے۔ مانی فٹ! اس کی چاکری کرتی ہے میری جوتی۔ اسے ہر صورت مجھے برابر کا حصہ دار بنانا ہو گا ورنہ میں ہر حد سے گزر جاؤں گا۔“ وہ ہانڈ کر لولا۔

”تم سوری کیف! میں تمہاری بات نہیں مان سکتی۔ مجھے اسے شوہر کا اعتبار اور مان عزیز ہے۔ میں اس کے اعتماد کا خون نہیں کر سکتی۔“ میرے دو ٹوک فیصلہ کن انداز نے اسے بھڑکا کر رکھ دیا تھا۔ وہ مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔

”میں تمہیں ایک کی زندگی سے نکال پھینکوں گا۔“ وہ غصے کے مارے کف اڑا رہا تھا۔

اور پھر اس نے اپنا کامیج کر دکھایا۔ وہ مجھے ایک کی زندگی سے باہر نکال چکا تھا۔ یہ اسی مان، اعتبار اور اعتماد کو بچانے کا نتیجہ تھا جو میں اپنی ماں کے گھر واپس آ چکی تھی۔ ایک نے کچھ زیادہ تو نہیں کہا تھا مگر اس کے چند الفاظ نے میرے جسم سے گویا جان تک نکال لی تھی۔

”مجھے دکھ ہوا ہے ساجیہ! میرا دل اس وقت صدمے کے زیر اثر ہے۔ میں تمہارے ساتھ سختی سے پیش نہیں آتا چاہتا۔ تم ابھی چلی جاؤ ڈرائیو باہر منتظر ہے۔ اگر میں اس صدمے اور دکھ کی کیفیت سے سمجھو تا کر کے سنبھل گیا تو تمہیں لینے آ جاؤں گا۔ ورنہ ہمارے راستے جدا ہیں۔ تم وہ کاغذات بھی ساتھ لے جانا۔ میں تحفہ دے کر واپس لینے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

دھیما لہجہ، جھکی آنکھیں اور ضبط کی سرخیوں سے سجا چہرہ۔ اس نے نہ وضاحت طلب کی تھی اور نہ ہی مجھے خود سے دور کرنے کی وجہ بتائی۔ مگر میں جان تو چکی تھی کہ کیف کی خود غرضی اور کمینگی رنگ لے آئی ہے۔

میں نے اسی شب سلمان باندھا تھا اور خالی دل لیے ایک کے گھر سے نکل آئی۔ اپنے پیچھے داوی، ماما، رونا، سسی کو منتظر اور رونا پچھوڑ کر۔ مگر پورے ڈیڑھ ہفتے بعد بھلا کیا ہوا؟

”آپ۔۔۔“ میں نے پردے برابر کر کے پیچھے مڑ کر دیکھا تو گویا پھر ہو گئی تھی۔ ایک عین میرے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ کب دے یاؤں کرے میں داخل ہوا تھا مجھے

قطعاً خبر نہیں ہو سکی۔ اپنی تلخ اور زہریلی سوجھ بوجھ میں گم کھڑکی کے سامنے کھڑے کھڑے میری ٹانگیں گویا شل ہو کر رہ گئی تھیں۔

”ہاں میں۔۔۔ کیا تمہیں امید نہیں تھی کہ میں واپس آؤں گا۔“ وہ ہی مخصوص نرم اور دھیمالہجہ۔ میرے دل کی دھڑکنیں اول روز کی طرح بے ترتیب ہو گئی تھیں۔

”جس طرح مجھے گھر سے نکالا تھا۔ بھلا کوئی امید باقی رہ گئی تھی کیا؟“ نجانے کہاں سے ڈھروں آنسو میری آنکھوں میں خود بخود اتر آئے تھے۔

”وہ وقت اور لمحے ہی کچھ ایسے تھے ابھی تک اپنے ان الفاظ پر پچھتا رہا ہوں مگر میں بھی بھلا کیا کرتا؟“ کیف نے کہاں ہی کچھ اس طرح سے سنائی تھی کہ اس کے حرف حرف پر اعتبار آ گیا۔ تم سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ یہی میری سب سے بڑی نادانی تھی جس پر ابھی تک پشیمان ہوں۔ جو کچھ وہ بتا رہا تھا، میری طرح کوئی بھی آدمی ان باتوں کے جال میں پھنس سکتا تھا۔“ وہ سر جھکائے دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ میں ابھی لفظوں کو ترتیب دے رہی تھی جب ایک نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔

”پلیز سائی! پہلے میری بات سن لو۔ پھر جو کچھ کہو گی، میں سنتا رہوں گا۔ جو سزا سناؤ گی۔ مجھے منظور ہو گی۔“ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا تھا۔ گویا کہہ دینے یا نہ کہنے کے درمیان الجھ رہا تھا۔ پھر جب بولا تو آواز میں ہمیشہ والا ٹھہراؤ تھا۔

”بات کہاں سے شروع کروں۔۔۔ بہت پہلے سے“ جب میں چوہدری قیوم کے آگن میں پھیلنے والا پہلا پتھر تھا۔

پورے آٹھ سال تک میں پہلا اور آخری پتھر ہی رہا تھا۔ اس دوران میرا کوئی اور بھائی اس دنیا میں نہیں آیا۔ میرے دادا کے لیے یہ بات خاص تشویش ناک تھی مگر انہوں نے مجھ پر ہی گویا صبر کر لیا تھا۔ ان کی مجھ

سے محبت کوئی دھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ مجھے اپنی زندگی کی واحد خوشی سمجھتے تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ میں گونگے والدین کی اولاد تھا۔ میری ماں اور باپ دونوں قوت گویائی سے محروم تھے۔ میرے ابا، دادا کی اکلوتی اولاد تھے۔ ان کی زمینوں اور کارخانے کے اکلوتے وارث۔

ان کے ہاں، میں پہلا صحت مند بچہ پیدا ہوا تھا۔ میرے دادا کے لیے میری پیدائش ہفت اقلیم کی دولت کے برابر تھی۔ انہوں نے جی بھر کے میرے ناز اٹھائے تھے۔ مجھے بے تحاشا محبت سے نوازا تھا۔ میں ان کی محبت کے حصار میں خود کو ہمیشہ محفوظ سمجھتا تھا مگر یہ حصار تب ٹوٹ کر بکھر گیا جب میرے دادا اس دنیا سے چلے گئے مگر جانے سے پہلے وہ اپنی ساری جائیداد میرے نام کر گئے تھے۔ اور ان کے چلے جانے کے بعد کے بعد دیگرے میرے چار اور بھائی پیدا ہوئے۔ اور پھر ہمارے ابا معمولی سے بخار میں چل بے۔ تب میں کافی سنبھل چکا تھا اور کچھ وقت کی سختیوں نے مجھے اچھی طرح سے سارے سبق پڑھا دیے تھے۔

میں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ کاروبار سنبھال لیا تھا۔ تب کیف بہت نا سنجھ اور نادان تھا اور میری نظر میں تو بالکل بچہ تھا۔ مجھے اپنی ماں اور بھائیوں سے بہت محبت ہے۔ اسی محبت نے مجھ سے بے تحاشا جدوجہد کرواتا ہے۔ میں نے اپنے قوت بازو پر، اپنی محنت اور جدوجہد سے اپنا گھر بنایا تھا۔ چار فرخ نماز خریدیں۔ ایک دم سے سارا کچھ نہیں ہو گیا تھا۔ بے تحاشا محنت اور قربانیوں کے بعد میں اپنا ایک نام بنالیا تھا۔

تب کیف بڑھنے کے لیے ہاسٹل میں مقیم تھا اور ماں کی کسی کزن کے گھر بھی اس کا آنا جانا کرتا تھا۔ انہی کی بیٹی یو ساسہ وہ شادی کرنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ اس بات سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ مگر وہ کچھ یوں کہ ہماری رشتے کی اس خالہ نے یعنی یو ساسی ماں نے میرے خلاف کیف کے دل میں زہر بھرتا شروع کر دیا تھا۔

وہ چاہتی تھیں کہ کیف اپنے حصے کی جائیداد لے کر ان کے پاس آجائے اور جب میں نے ایمان داری کے ساتھ قانونی طور پر اپنے چاروں بھائیوں کو دادا کی جائیداد کا حصہ دار بنایا تو ہم سب کے حصے میں تھوڑی تھوڑی سی برابری آئی۔ یہی بات ہماری خالہ کو بھڑکائی تھی۔ ان کی نظر میرے کاروبار پر بھی اور وہ چاہتی تھیں کہ میں اپنے بزنس میں سے بھی کیف کو حصہ دوں۔ ظاہر ہے میں نے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں کیف مجھ سے بدگمان ہو گیا۔ میرے ساتھ جھگڑتا رہا۔ بات خون خرابے تک آئی تھی۔ میں کیف کو حصہ دار بنانا بھی لیتا اگر بیچ میں خالہ اور ان کی بیٹی نہ ہوتی۔

یہ مسئلہ خود اور انا کا بن گیا تھا۔ میری اور کیف کی ناراضی چل رہی تھی۔ ایک دن وہ خود میرے پاس چلا آیا۔ اپنی کزشتہ غلطیوں کی معافی مانگتا رہا تھا میں نے بھی کھلے دل سے اسے معاف بھی کر دیا۔ ہمارے پہلے کی طرح تعلقات بحال ہو گئے تھے۔ مجھے نہیں خبر تھی کہ یہ سب ایک سازش اور منصوبے کی کڑی ہے۔

پھر ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ وہ پھوپھو کے بزنس میں قیام پذیر فیملی سے خاصی انڈر اسٹینڈنگ رکھتا ہے اور ان کی بیٹی کو وہ میرے لیے پسند کر چکا ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی عورت ایسی نہیں تھی جو ہمارے اس طرح کے معاملات نمٹاتی۔ فائز اور عون کی شادیوں کے تمام معاملات اسی نے ہی دیکھے تھے۔

اگرچہ فائز اور عون نے لومینج کی تھی۔ دوران تعلیم ہی دونوں پر شادی کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ہر حال جو بھی تھا، احسن طریقے سے ان کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ اما کی ساری ذمہ داریاں کیف نے ہی نبھائیں۔

ادھر کیف نے مجھے جو کچھ ہمارے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے لگا، تم میرے آئیڈیل کا ایک حصہ ہو۔ میرے دل نے ہمارے حق میں فیصلہ دے دیا تھا اور میں بغیر دیکھے ہی تمہاری سادگی اور معصومیت کا اسیر ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ ہماری ماں ایسے معاملات نہیں دیکھ

سکتی۔ جو کچھ کرنا تھا، کیف نے ہی کرنا تھا اور وہ اپنی پلاننگ کے تحت سب کچھ کرتا رہا اور میں اپنی سادہ دلی میں اس سے ہمیشہ دھوکا کھاتا رہا۔

شادی کے سلسلے میں ہونے والے اخراجات کے لیے جب رقم کم پڑ گئی تو وہ دوبارہ مجھ سے پیسوں کا مطالبہ کرنے لگا۔ اگر مجھے سمجھتا ہوتا تو میں تب ہی سمجھ جانا کہ میں نے شک اور بدگمانی کو کبھی دل میں جگہ نہیں دی تھی۔ پھر حق مکر کے طور پر اتنی بھاری جائیداد پر کیف کی ضد اور اصرار۔ میں حیران ضرور ہوا تھا مگر چونکا پھر بھی نہیں۔ میں ناندانستگی میں وہ ہی سب کچھ کرتا رہا جو وہ مجھ سے کروانا چاہتا تھا۔

میرے لیے سب سے بڑا انعام تم تھیں ساجید! ایسا انعام جو مجھے کیف کے توسط سے ملا۔ میں تمہاری سادگی اور معصومیت کا اسیر ہو گیا تھا۔ مجھے تم سے اور تمہارے خالص جذباتوں سے بھرے دل سے محبت ہو گئی تھی۔ تب کیف نے سوچا کہ بازی الٹتی جا رہی ہے اور وہ اس بازی کو اپنے حق میں کرنے کے لیے بے صبری کا مظاہرہ کر گیا یعنی تمہارے ساتھ دو ویڈیو گفتگو کر کے ایسی گفتگو جو کسی نے من و عن سن لی تھی اور پھر مجھے بھی سنادی۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ لوگ اپنے زرخیز دماغ کو لوگوں کے گھر اور دل اجاڑنے کے لیے کیسے استعمال کر لیتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ میرے دل میں شک کی آگ جلا کر خود وہ اپنے دل کو آباد کرنے گیا تھا مگر ہماری لالچی اور خود غرض خالہ نے کل رات یو ساسا کو ایک کروڑ پتی سیٹھ سے بیاہ دیا اور کیف قیوم کے دل پر گویا شام غریباں اتر آئی۔ اس صدمے میں وہ بانیگ سے ٹکرا کر اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ ادھر آنے میں اسی لیے دیر ہو گئی تھی کہ مجھے اس کے پیچھے ہسپتال جانا پڑا۔

دیکھو مسائی! مجرم تو وہ ہم دونوں کا ہے مگر میں نے اسے تمہاری طرف سے بھی معاف کر دیا ہے۔ کیا کروں، میری قوت گویائی سے محروم ماں، بول نہیں

سکتی، مجھے حکم نہیں دے سکتی۔ مگر اس کی آنکھوں کی التجا کو لوٹا دینا میرے بس میں نہیں ہے اور میری ماں کی خواہش ہے کہ جب میں واپس آؤں تو تم بھی میرے ساتھ ہو۔ کیا تم میری ماں کی خواہش پوری کرو گی؟“ وہ آنکھوں میں اس کے دیے سجائے منتظر کھڑا تھا۔ میری ایک ہاں نے اس کے چہرے کو تباہی بخش دینا تھی۔ مگر میں بھی پورے ایک ہفتے کی ناراضی کا حساب لیے بغیر اسے معاف نہیں کر سکتی تھی۔ اگرچہ ایک مجرم نہیں تھا۔ مجرم تو وہ تھا، جولاچ میں اور یوسا کے حصول کی خاطر خون کے رشتوں کو بکھو دینے والا تھا۔ اب اس مجرم کو بھلا اور کیا سزا دی جانی تھی۔ بے چارہ دل نزنو نے کے ساتھ ساتھ ٹانگ بھی تڑوا چکا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ پشیمان تھا، شرمندہ تھا۔ سو میں نے سوچا تھا کہ ایک پشیمان کو بھلا اور پشیمان نہ ہی کیا جائے تو بہتر ہے۔

مگر ایک کوسٹانے کا میں پورا پورا ارادہ رکھتی تھی۔ سو اسی لیے خود ناراضی کا خول چڑھائے بولی۔
”میں آپ کو معاف نہیں کر سکتی ایک! آپ واپس چلے جائیں۔ میں اپنی انسلٹ نہیں بھول سکتی۔ آپ نے بغیر وضاحت لیے مجھے گھر سے کیوں نکالا؟“
”مجھے معاف کر دو ساجی! میں واقعی شرمندہ ہوں۔“ ایک میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر گھبرا اٹھا۔ وہ ہر صورت مجھے منانا چاہتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ ایک کو منانا آسانی کہاں تھا اور ابھی وہ اسی سوچ میں گم تھا کہ مجھے کیسے منائے کہ اچانک دھاڑ سے دروازہ کھلا اور سہی اور نیا کمرے میں داخل ہو کر مجھ سے لپٹ گئیں۔

”ہم آپ کو زبردستی اٹھا کر لے جائیں گے بھابھی! اللہ کی قسم، آپ کے بغیر پورا گھر ویران ہو گیا ہے۔“ سہی اور نیا بھرائی آواز میں کہہ رہی تھیں۔ میں نے ان دونوں کی بے لوث محبت کو محسوس کرتے ہوئے ایک کو دیکھا تو وہ معصوم صورت بنا کر لولا۔

”اللہ کی قسم! میرا دل اور کرا بھی ویران ہے۔“ میری نظر ایک کے چہرے سے ہٹ کر ایک اور چہرے سے الجھ گئی تھی۔ یہ چہرہ ماما کا چہرہ تھا مگر میں جانتی تھی کہ یہ خاموش آنکھیں اور اداس چہرہ کیا التجا کر رہا ہے۔ مجھے اس لمحے ٹوٹ کر اس عورت کی خاموشی پر پیار آ گیا تھا۔

کچھ لوگ اس خاموشی کو پراسراریت سمجھتے تھے مگر میں جانتی تھی یہ پراسراریت نہیں۔ اس خاموشی میں ایک کی ماں کا بھرم پوشیدہ ہے۔ آج بھی میرے گھر والے اس حقیقت سے ناواقف تھے۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ سفینہ بیگم کیوں خاموش رہتی ہیں اور نہ ہی میں نے کسی کو بتانے کی کوشش کی تھی کہ ماما خاموش کیوں ہیں۔ وہ قوت گویائی سے محروم ہیں۔

میری سوچتی ہوئی نظر نے اس لمحے ایک مرتبہ پھر ماما کے پاکیزہ چہرے کا طواف کیا تو ان کے چہرے کی التجا میرے دل پر گویا جا گئی۔

”ساجی! چلو نا، میرا گھر اور میرے بچے کا دل بچ بچ تمہارے بغیر ویران ہے۔“

میرے دل کو ایک دم کچھ ہونے لگا تھا اور میں بھاگ کر ماما سے لپٹ گئی۔ بدگمانی کے بادل چھٹ چکے تھے۔ دلوں پر جہی گرد صاف ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے گھر والوں اور ایک کے گھر والوں کے چہرے پر چمکتی خوشی کو دل سے محسوس کیا تھا اور گویا کھل کر ہنس کر ا دی۔

کالے، اودے، سرمئی، سیاہ بادلوں کے پیچھے کا منظر خود بخود صاف ہو گیا تھا۔ اب ستاروں سے بھرا آسمان میرے سامنے تھا، اور میں نے کمکشائوں کی بارات کو اپنے گھر میں اترتے دیکھا اور مسکرانے لگی۔

